ناول
15.11.63

ایک مہاجر

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

(ناول)

اُنشا

رئیس احمد جعفری

کتاب منزل لاہور

جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ مطبوعات ع۱۷

مصنّف ———— رئیس احمد جعفری
طابع ———— شیخ نیاز احمد
کاتب ———— افتخار حسین
مطبع ———— علمی پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر ———— کتاب منزل، لاہور
اشاعت ———— دوم

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو!

[illegible]

انتساب

وزیر مہاجرین خواجہ شہاب الدین کے نام

(بغیر اجازت کے)

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں

جھلکتی ہے تری ملت کی آبرو اس میں

فہرس

اندرون خانہ	۹
بات میں بات	۱۷
یہ کیا ہُوا؟	۲۸
— قیامت گذر گئی!	۳۹
پُرانا قلعہ	۵۳
پُر درد کہانی	۷۱
امتیاز بھی —	۹۷
اسپیشل ٹرین	۱۱۲
شہر ناپُرساں	۱۳۴
دیوانہ کو کیا کہیے!	۱۵۵
ایک اور غم!	۱۶۸
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ	۱۷۵

زندگی۔ بندگی۔ بیچارگی ۱۹۳
گردشِ مدام ۲۲۹
ناکردہ گناہ ۲۴۵
غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا ۲۶۲
حسرتِ تعمیر ۲۷۳
ایک اور مصیبت ۲۸۵
کیا سے کیا؟ ۳۰۲
دل کی باتیں ۳۲۵
انکار و اقرار ۳۴۱
بیداری یا خواب ۳۵۵

باب ۱

اندرونِ خانہ

حاجی عبدالستار دہلی کے بہت بڑے تاجر تھے، سبزی منڈی میں ان کی میوے اور پھل کی آڑہت تھی، شہر کے تمام چھوٹے چھوٹے تاجر انہی سے مال خریدتے تھے، چاندنی چوک میں، کارونیشن ہوٹل کے سامنے، ان کی ایک بہت بڑی دکان "جنرل اسٹورس" کے نام سے مشہور تھی، کئی ملوں اور لمیٹیڈ کمپنیوں کے ڈائرکٹر تھے، دو لڑکے تھے، امجد اور وحید! تین لڑکیاں تھیں، ریحانہ، سلطانہ، اور رخسانہ! ریحانہ کی شادی ہو گئی تھی، ایک ننھے سے بچے کی ماں بھی بن چکی تھی، اُس کا شوہر نیاز دلی کالج میں پروفیسر تھا، سلطانہ کی منگنی نیاز کے چھوٹے بھائی امتیاز کے ساتھ ہو چکی تھی، جو دہرہ دون کے سینڈ ہرسٹ ملٹری کالج میں تربیت حاصل کر رہا تھا، رخسانہ اندرپرست گرلز کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھی، چونکہ سب سے چھوٹی تھی اس لیے گھر بھر کی

"چل ہٹ، جھوٹی کہیں کی!"
رخسانہ نے ایک انداز کے ساتھ کہا،
"مجھے جھوٹا نہ کہنا، نہیں تو ——"
"کیا کرے گی تو؟"
"کہدوں گی جاکر ابھی ابا میاں سے، ذرا دیر کے لیئے امتیاز بھیا کو بلادیں!"
سلطانہ کھلکھلا پڑی،
"اتنی ہمت ہے تجھ میں؟"
"کیوں نہیں ہے!"
اتنے میں ریحانہ آگئی، اس نے سلطانہ سے کہا،
"ارے بھئی سلطانہ کچھ سنا تم نے؟"
وہ بولی،
"کیا ہوا آپا!"
"اپنی دلاری بہن رخسانہ کے بارے میں؟"
رخسانہ نے جل کر کہا،
"اونہہ، پھروہی!"
ریحانہ نے کہا،
"تیرے "پھروہی" کہنے سے چپ ہوجاؤں گی، ہاں سلطانہ رخسانہ کی شادی ہورہی ہے، نئی دِلّی میں، اپنے لیئے ایک کوٹھی

چہیتی تھی، ماں، باپ، بھائی، بھاوج، سب ہی اسے چاہتے تھے۔

روشن آرا باغ کے قریب سبزی منڈی میں، ایک خوشنما اور دل آویز کوٹھی، ابھی حال میں حاجی صاحب نے تعمیر کرائی تھی، سارا کنبہ وہیں رہتا تھا۔ جب یہ کوٹھی بن رہی تھی، رخسانہ نے بڑی ضد کی کہ یہاں کے بجائے نئی دلّی میں بنائی جائے، لیکن حاجی صاحب نے اس مطالبہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، وہ قدیم تہذیب اور وضعداری کا زندہ نمونہ تھے، انھوں نے رخسانہ سے کہا جس محلہ میں ہم بڑوں سے رہتے چلے آئے ہیں اسے کیوں چھوڑیں؟ تجھے نئی دلّی اتنی ہی پسند ہے، تو شادی کے بعد وہاں اپنی الگ کوٹھی بنا لیجو، بیچاری رخسانہ جھینپ کر خاموش ہو گئی، اور ریحانہ نے مذاق اڑانا شروع کر دیا، کہنے لگی،

"ابّا جان، یہ ہماری رخسانہ آخر دلہن بنیں گی کب؟"

اور رخسانہ جھپ سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی، وہاں سلطانہ بیٹھی ہوئی تھی، اس نے پوچھا،

"کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

رخسانہ نے کہا،

"تمھاری شادی کی، امتیاز بھیّا بہت بے چین ہیں، بیچارے شادی کا مبارک دن اور تمھیں دلہن بنا ہوا دیکھنے کے لیئے"

سلطانہ کے چہرے پر خوشی کی سرخی دوڑ گئی، اس نے کہا،

"چلیں کہاں بی بنّو!"

رخسانہ جل ہی تو گئی۔

"جہاں ہمارا جی چاہا، تم کون پوچھنے والی!"

ریحانہ کیوں چپ رہتی،

"میں تمھارے پیچھے پیچھے چلوں گی"

"کیوں بھلا؟"

"شادی کی خوش خبری سارے گھر کو سناتے سناتے تمھیں "بدھو" کردوں گی، دیکھ لینا!"

رخسانہ بیٹھ گئی!

"اچھا نہیں جاتی، اب تو پنڈ چھوڑو میرا!"

"ایک شرط ہے!"

وہ جل کر بولی،

"ہم نہیں مانتے شرط ورط!"

"تو ہم بھی صلح پر قائم نہیں رہیں گے، سوچ لو! ——— ورنہ پھر وہی گانا سنا دو، ——— کیا ہے موا یاد بھی نہیں آتا، ہاں ہاں وہی ——— ایک بنگلہ بنے نیارا، رہے جس میں کنبہ سارا! شاباش سنا دو!"

اور روٹھی ہوئی رخسانہ من گئی، اور اس نے میٹھے سُروں میں وہی بول دوہرانا شروع کیے، جو ابھی ریحانہ کی زبان سے نکلے تھے۔

بجوا رہی ہے!"

"یہ کیا کہہ رہی ہو آپا؟"

"اے سچ، ابھی ابا میاں سے یہی باتیں ہو رہی تھیں!"

سلطانہ نے حیرت سے پوچھا،

"رخسانہ کی شادی ہو رہی ہے لیکن کس سے؟ بات کہاں سے آئی ہے؟"

ریحانہ نے کہا،

"بات تو ابھی کہیں سے نہیں آئی!"

"تو کس سے ہو رہی ہے آخر؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولی،

"یہ بھی نہیں معلوم!"

سلطانہ نے کہا،

چلو ہٹو آپا، تم بھی خواہ مخواہ کا مذاق کر رہی ہو بچاری سے!

"مذاق کیسا کوٹھی جو بن رہی ہے؟"

"بغیر دولھا کی برات میری سمجھ میں نہیں آتی!"

ریحانہ نے جواب دیا،

"تو تو ہے اچھی خاصی بگّی، ارے بھائی پہلے نئی دلّی میں کوٹھی بن رہی ہے پھر جیسی شاندار کوٹھی بنے گی، ویسا ہی شاندار دولھا تلاش کیا جائے گا!"

سلطانہ ہنسنے لگی، رخسانہ بھر جانے کے لیے اٹھی، ریحانہ نے کہا،

امتیاز کا نام سُن کر، سُلطانہ شرما گئی،

ریحانہ بولی،

"تم ٹھہرے پُرانے کانگرسی، تم تو یہیں رہو گے؟"

"اس میں شک بھی ہے کچھ؟ کیوں نہیں رہیں گے، بشرطیکہ مسلم لیگ رہنے دے چین سے!"

رخسانہ نے کہا،

"بھائی صاحب تو مسلم لیگ پر خار کھائے بیٹھے ہیں، کیوں نہیں رہنے دے گی مسلم لیگ؟"

نیاز نے پھر ایک قہقہہ لگایا،

"جی ہاں، بھرت پور سے، الور سے، اور دوسرے مقامات سے پِٹے ہوئے، اور لُٹے ہوئے مسلمانوں کے قافلے پر قافلے چلے آرہے ہیں جامع مسجد کے پاس جا کر دیکھو، تو معلوم ہوگا، احمد شاہ ابدالی، یا نادر شاہ درّانی کا لشکر اُترا ہُوا ہے، لیکن صرف لشکر ہے، نہ احمد شاہ کا پتہ ہے نہ نادر شاہ کا! اسی لیے نہ لشکر کے پاس اسلحہ ہیں، نہ لڑنے کی ہمّت، سیوک سنگھی ویسی ہی پٹائی کر رہے ہیں، جیسی احمد شاہ نے پانی پت کے میدان میں مرہٹہ سپاہیوں، اور کمانداروں کی کی تھی، پھر یہ تو ابھی انجام کا آغاز ہے، اس آغاز کا انجام کیا ہوگا، میرے تصوّر کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں!"

رخسانہ نے بڑے پیارے لہجہ میں کہا،

رخسانہ کی مدبھری تانیں، آہستہ آہستہ فضا میں بکھر رہی تھیں، کہ پروفیسر نیاز آ گئے، انھیں دیکھ کر رخسانہ خاموش ہو گئی، ریحانہ نے کہا،

"ارے ارے، چپ کیوں ہو گئیں؟"

سلطانہ نے کہا،

"بھائی صاحب سے شرماتی ہو؟ ارے گائے جاؤ اپنا گیت!"

رخسانہ پھر بگڑ گئی،

"شرمانے کی کیا بات ہے، ختم ہو گیا!"

نیاز نے مسکراتے ہوئے کہا،

"ہاں بھئی واقعی ختم ہو گیا، بچارہ اکھنڈ ہندوستان ختم ہو گیا، یار لوگوں نے آخر بٹوارہ کرا ہی لیا"

سلطانہ بولی،

"لیکن بھائی صاحب، اب ہوگا کیا؟"

نیاز نے ایک قہقہہ لگایا،

"ہم سے کیا پوچھتی ہو؟ اپنے ابا میاں سے پوچھو، جن کی تجوری کیلئے مسلم لیگ سم سم کا کام دیتی تھی، ادھر یہ مبارک نام لیا ادھر کھلی، اور روپے انڈیلنے لگی، یا امتیاز میاں سے پوچھو، جنھوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان کے بجائے پاکستان کو پسند فرمایا ہے!"

باب ۲

بات میں بات

حاجی عبدالستار کی چھوٹی بہن نسرین بیگم، ایک عرصہ سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھیں، شوہر کافی سرمایہ چھوڑ کر اس دُنیا سے سدھارے تھے، جوانی میں بیوہ ہوئی تھیں، اور اب بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھ چکی تھیں، عمر کوئی پچاس کے لگ بھگ ہوگی، آنکھوں کا تارا صرف ایک بیٹا تھا ریاض! بڑا خوبصورت، اور اس سے کہیں زیادہ خوب سیرت، ماں کا جاں نثار، خادم، گھر کا زندہ دِل مالک۔ اسی سال لاہور میڈیکل کالج سے، ڈاکٹری کی سند لے کر آیا تھا، اور کمانے کے لیے نہیں، محض خدمت خلق کیلئے اس نے مطب بھی شروع کر دیا تھا۔

قرول باغ میں، ایک پہاڑی کے اُوپر، ایک نہایت خوش قطع، کوٹھی تھی، جس کا نام "خوش منظر" تھا' یہ بیگم نسرین کا مستقل مسکن تھا، اتنی

"بڑے ولی اللہ!"

نیاز کو پھر، ہنسی آگئی،

"ارے پگلی، ولی اللہی کا دَور ختم ہو گیا، یہ تو ڈنڈے کا دَور ہے، خُدا خیر کرے، مجھے تو آثار بہت بُرے نظر آتے ہیں!"

ریحانہ نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا،

"خُدا کے لیے۔ اب بس کرو تم تو قہقہے لگا رہے ہو، اور یہاں جان پر بنی جا رہی ہے مارے ہول کے!"

نیاز نے سگریٹ سلگایا، پھر ایک قہقہہ لگایا، اور ایک بڑا سا کش لگاتا ہُوا باہر چلا گیا!

کبھی کبھی وہ گھڑی دو گھڑی کے لیے کھڑی سواری بھائی کے ہاں چلی جاتی تھیں، جب بھی جاتی تھیں، اپنے ساتھ دو چار روز کے لیے رخسانہ کو ضرور لاتی تھیں، بلکہ وہ خود فرمائش کرکے ان کے ساتھ آتی تھی، اور آتے ہی گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتی تھی، بھائی کو تو کبھی رخسانہ کے بھیجنے میں تامل ہوتا ہی نہیں تھا، لیکن بھاوج دانت کٹکٹا کے رہ جاتی تھیں، وہ دل ہی دل میں بہت کڑھتی تھیں، لیکن جب اپنا سونا کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کا کیا دوش، یہ موئی رخسانہ خود ہی تلے اُوپر ہوتی رہتی ہے، پھوپھی کے، نگوڑ ماری کو کچھ کہوں تو سارا گھر رو کے سر پر اٹھا لے گی، بھائی بھی اسی کا ساتھ دیں گے، بہنیں بھی، اور باپ بھی، لیکن یہ جتنے چاہے پینگ بڑھا لے، بہو تو نہیں بننے دوں گی رخسانہ کو نسرین کا اور ننھی میاں ریاض، رخسانہ کے دولہا بنیں گے، میں کہتی ہوں، ریاض کے مقابلہ میں میرا ارشاد کیا بُرا ہے، ہاں میں بھولی سو برائیوں کی ایک برائی اس میں یہ ہے کہ میری بہن کا لڑکا ہے ——— ! لیکن کچھ بھی ہو، رخسانہ کا دولھا، ارشاد ہی بنے گا، کوئی اور نہیں بن سکتا!

قیامت تک نہیں بن سکتا!

اور جب عالم خیال میں ارشاد کو دولھا، اور رخسانہ کو دُلھن بنا ہُوا دیکھ کر فاتحانہ انداز میں ایک تبسّم کے ساتھ انھوں نے سر اُٹھایا تو رخسانہ آنکھوں کے سامنے نہیں تھی، ڈھونڈھتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچیں

بڑی کوٹھی، اور ملازمین کے علاوہ صرف دو نفر، ایک خود نسرین بیگم، دوسرا ریاض، ریاض بھی اب آیا تھا ورنہ اکیلی نسرین اس سارے گھر کی مکین تھیں، حاجی صاحب اپنی چھوٹی بہن کا بہت خیال رکھتے تھے، لیکن ان کی بیوی اتنا ہی جلتی تھیں، نسرین بیگم چونکہ بہت صلح جو اور امن پسند تھیں اس لیے بھائی کے ہاں بہت کم آتی جاتی تھیں۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ رخسانہ کو بیاہ کر اپنے گھر لائیں، وہ جانتی تھیں، ریاض بھی اسی امید میں زندہ ہے، اور خود رخسانہ بھی ریاض پر مائل ہے، لیکن یہ جانتے ہوئے بھی وہ خاموش تھیں، انھیں اچھی طرح معلوم تھا، ان کا پیام قبول نہیں ہو سکتا، حاجی صاحب کی بیوی، کسی چمار کے ہاتھ میں رخسانہ کا ہاتھ پکڑا دیں گی، لیکن ریاض کو اپنا داماد بنانا نہیں منظور کریں گی، وہ سوچتی تھیں، ریاض کی زندگی ناکام رہے، یہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ پیام دے کر بھائی کا گھر جہنم بنا دیا جائے، پھر بات بہت بڑھ جائے گی، بھائی اس پیام کو فوراً منظور کرے گا، بھاوج صاف انکار کر دے گی، پھر بھائی اور بھاوج میں زبردست لڑائی ہوگی، میں اپنے بیٹے کے لیئے، اپنی راحت کے لیے بھائی کا گھر برباد کروں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، میں اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے اکلوتے بھائی پر قربان کر سکتی ہوں لیکن بھائی کی بھینٹ بیٹے پر نہیں چڑھا سکتی!

نہیں!

کبھی نہیں!

جلال میں آکر بولیں،

"ہاں میں پگلی اور دیوانی تو ہوں ہی، میرا اور کام ہی کیا ہے، سوا اس کے کہ تم لوگوں کے پیچھے پڑا کروں، تم لوگ میری بیٹی کہاں ہو، سوت ہو، تمھارے پیچھے پنجے جھاڑ کر نہ پڑوں گی تو کسے تلاش کروں گی!"

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہوئی،

"جاتی ہوں ابھی رخسانہ کو لیئے آتی ہوں وہاں سے جاکر!"

"جاؤ، شوق سے جاؤ اور وہاں جاکر خوب لگائی بجھائی کرو، اپنی سوتیلی ماں کی!"

سلطانہ کو پھر ہنسی آگئی،

"اب سوتیلی ماں بن گئیں، اماں آج تمھیں ہُوا کیا ہے؟"

"اب پاگل بھی مشہور کردو، بلکہ ہوسکے تو پاگل خانے بھجوادو ــــــ دیکھو نمک حرام کو، یہ میری بیٹی ہے، اور مجھ سے زبان لڑا رہی ہے، بالشت بھر کا قد، گز بھر کی زبان ــــــ ریاض کے سامنے کوئی اس کی ماں کو بُرا کہے، تو وہ اس کی زبان کھینچ لے، اور یہاں صاحبزادی سامنے کھڑی ماں کے بکھان کر رہی ہیں!"

سلطانہ بے بس ہوگئے، اب آنسوؤں سے مدد طلب کرنے والی تھی کہ ریحانہ آگئی،

"کیا ہُوا اماں!"

"معاف کرو، بیٹی، مجھے اماں نہ کہو، جو ہوں گی، تم لوگوں کی اماں وہ

تو معلوم ہُوا وہ تو پھوپھی کے ساتھ قرول باغ گئی،

"قرول باغ گئی؟ لیکن کس سے پُوچھ کر؟"

جواب ملا، سلطانہ کے مُنہ سے،

"آپ کے سامنے تو گئی ہے بن ٹھن کے مسکراتی ہوئی، ابا میاں نے بھی کہہ دیا جاؤ!"

جل ہی تو گئیں،

"ہاں تمھارے ابا میاں! ———————"

پھر زہر خند کے ساتھ بولیں،

"وہ تو میں دم توڑ رہی ہوں، اور بہن کو آتا ہوا دیکھ لیں، تو یاسین پڑھنا بھول جائیں، اور یہ موئی رُخسانہ، میری لاش چھوڑ کر کے ان کے دامن میں ہلکتی ہوئی چلی جائے، جیسے باپ ویسی بیٹی!"

سلطانہ نے ماں کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہُوا اماں، کسی غیر کے ہاں تو نہیں گئی، پھوپھی ہی کے ہاں تو گئی ہے وہ بھی کتنا چاہتی ہیں اسے، ریاض کو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی چاہتی ہوں گی جتنا رخسانہ کو!"

"اچھا بس، زبان بند کرو، ریاض کا نام میرے سامنے مت لینا! کٹنی کہیں کی!"

سلطانہ کو ہنسی آگئی،

"یہ لو، میرے پیچھے پڑ گئیں!"

"لیکن بیٹی میں کردں کیا، جو ہے وہ مجھی کو جلاتا رہتا ہے، ابھی خرسلنہ آگ لگاکر گئی تھی کہ بی سلطانہ تیل کی بوتل لے کر آئیں، اور اُسے بھڑک کر اور بھڑکا دیا، ماشاءاللہ اس بھرے پُرے گھر میں میرا کوئی نہیں، میں تنہا ہوں،
بالکل تنہا!
ریحانہ اُٹھ کر پاس آئی، اس نے بڑے پیار سے ماں کے آنسو پونچھے اور کہا،
"اماں، ہم سب تم پر قربان ہو جائیں، تم ایسا خیال کیوں کرتی ہو؟"
ماں کی مامتا بھڑک اٹھی،
"اے نوج قربان ہوں تیرے دشمن، تُونے ابھی دُنیا کا دیکھا کیا ہے؟ خدا تیرا راج سہاگ قائم رکھے، مَیں تو اپنی ایڑی چوٹی پر سے انی ماں بیٹے کو قربان کردوں گی، جو اندر ہی اندر، ظاہر میں میٹھے بن کر مجھے جلاتے رہتے ہیں؟"
ریحانہ نے پوچھا،
"کون؟ کسے کہہ رہی ہو اماں؟"
"اونہہ اور کون؟ وہی نانگہ، تمھاری پھوپھی جان، اور کون، بڑی پس کی پُڑیا ہے، خوب جانتی ہوں، آج پھر بہلا پھسلا کر رخسانہ کو لے گئی، جنم جلی اپنے ساتھ!"
ریحانہ ہنس پڑی،

ہوں گی!"

سلطانہ کو موقع مل گیا، وہ چپکے سے کھسک گئی، ریحانہ نے اسکی جگہ لے لی،

"مجھے تو کچھ معلوم بھی نہیں، کیا ہُوا، کیا نہیں ہُوا، تم تو مجھ پر ہی برس پڑیں!"

"ٹھیک ہے بیٹی، تم بڑی معصوم ہو، خطا جو کچھ ہے میری ہے، بی سلطانہ کے پیچھے پنجے جھاڑ کر کون پڑا؟ میں! اور تم پر کون برس پڑا! وہ بھی میں، ابھی تمھارے ابّا میاں آتے ہوں گے، وہ بھی یہی کہیں گے جو تم کہہ رہی ہو سب ہی ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں!"

ریحانہ بڑی ملائمت سے بولی،

"امّاں، خدا کے لیے بتادو، بات کیا ہوئی؟ پھر جو چاہنا کہہ لینا!"

سلطانہ پھر کسی کام سے آگئی تھی، اس نے بڑی بہن سے کہا،

"کوئی بات ہو بھی! یونہی! ———— وہی رخسانہ کی بات، وہ پھوپھی کے ہاں کیوں گئی؟ حالانکہ ان کے سامنے گئی!"

سلطانہ تو اتنا کہہ کے پھر چلتی بنی، ریحانہ ہدف بنی بدستور سامنے بیٹھی تھی، اس نے بڑی ہمدردی کے ساتھ کہا،

"امّاں، للٰہ، خواہ مخواہ کو نہ کُڑھا کرو، اسی لیے تو تمھاری طبیعت خراب رہتی ہے!"

دہکتے ہوئے انگارے پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا، رونے لگیں،

"نہیں اماں، وہ تو بڑی اچھی ہیں، تمھارے کان بھر دئے ہیں کسی نے ان کے خلاف!"

"اور میں ایسی بچّہ کہ آگئی کہنے میں، بیٹی، یہ چونڈا میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیا ہے، دیکھ لینا یہ چاؤ پیار کہاں آکر ختم ہوگا؟"

کہاں ختم ہوگا؟"

"رخسانہ کے پیام پر نسرین تلی ہوئی ہے کہ صرف مجھے جلانے کیلئے رخسانہ کو اپنی بہو بنائے، پھر اسے خوب تکلیفیں دے، یہاں تک کہ مجھے دِق ہوجائے، اور میں مرجاؤں —————— لیکن میں بھی فیصلہ کرچکی ہوں، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہوجائے، رخسانہ اُس گھر میں بہو بن کر نہیں جاسکتی!"

ریحانہ نے رفع شر کے لیے کہا،

"ٹھیک ہے اماں، لیکن ابھی تو پھوپھی نے پیام نہیں دیا، اگر دیں گی تو دیکھا جائے گا، خوشی سے انکار کردیں گے لیکن میں ایک بات کہوں، مانو گی؟"

"کہو!"

"قبل اس کے کہ پھوپھی پیام دیں، کیوں نہ کہیں اور رخسانہ کی بات چیت پکّی کرلی جائے!"

ماں کا تمتمایا ہوا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا، بڑے میٹھے لہجے میں بولیں،

"بات تو ٹھیک ہے لیکن تیرے ابا جان کو کون سمجھائے؟ وہ تو اس میں

ہزاروں کیڑے نکالتے ہیں!"

"کس میں؟ کہیں سے پیام آیا ہے؟"

"ارشاد میں اور کس میں؟"

ریحانہ چونک پڑی،

"ارشاد میں؟"

"ہاں ہاں، ارشاد میں ——— تم بھی دو چار گالیاں دے لو بچارے کو!"

ریحانہ ابھی کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ حاجی ستار آگئے، انھوں نے بیوی سے مخاطب ہو کر پوچھا،

"پھر ارشاد کا ذکر شروع ہو گیا؟"

"ہاں ابا جان اسی کا ذکر ہو رہا تھا، اماں کا خیال ہے ——"

وہ بولیں،

"چپ مردی، میرا کوئی خیال ویال نہیں ہے، میں ریحانہ کی کون ہوتی ہوں، خدا اس کے باپ کو سلامت رکھے، وہی سب کچھ ہیں، جو چاہیں کریں، جس کے چاہیں دو بول پڑھا کر حوالے کر دیں، غیروں کی طرح بیٹھی ہوئی تماشا میں بھی دیکھ لوں گی ——— لیکن ایک بات کہے دیتی ہوں، ریاض اس گھر میں داماد بن کر نہیں آ سکتا، اور اگر آیا، تو مجھے نہیں، میری لاش کو سلام کرے گا!"

ریحانہ چپ رہی، حاجی ستار نے نرمی کے ساتھ کہا۔

چاہیئے، میں تمھاری خاطر سے یہ کر سکتا ہوں، کہ نجمانہ کی ریاض سے شادی نہ ہو، لیکن اس حد تک تمھاری خاطر میں آگے نہیں جا سکتا، کہ ارشاد کو اس کا شوہر بنا دوں، سمجھیں؟"

"ہاں سمجھ گئی!"

اور وہ جدھر سے آئی تھیں اُدھر واپس چلی گئیں!

"تم ریاض کا نام کیوں لیتی ہو؟ نہ جانے تمھارے دل میں یہ بات کس طرح بیٹھ گئی ہے، نسرین نے آج تک مجھ سے اشارۃً کنایتہً بھی نہیں کہا، بلکہ میں نے اڑتی سی خبر سُنی ہے، نسرین کوئی اور جگہ ڈھونڈ رہی ہے، یہاں اس کا ارادہ ہی نہیں ہے!"

تڑ سے بولیں،

"تو یہاں کون ان کے انتظار میں بیٹھا ہے؟"

حاجی صاحب نے کہا،

"بیگم، آج ایک بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے!"

"فرمایئے، کیا حکم ہے؟"

"اب میں ارشاد کا ذکر نہ سنوں؟"

"منظور ہے ———— لیکن ایک شرط ہے میری!"

"کہو!"

"میرے سامنے اس سلسلہ میں کبھی ریاض کا ذکر نہ آئے!"

"تمھاری یہ شرط بے تکی ہے، اس لیے کہ ارشاد، اور ریاض کا کوئی مقابلہ نہیں، ارشاد کندۂ ناتراش ہے، اجڈ، جاہل، گنوار، اور ریاض کو جو دیکھتا ہے، اس کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے، ابھی ڈاکٹری کی ڈگری لے کر آیا ہے، لیکن رفع شر کے خیال سے میں تمھاری یہ شرط منظور کیے لیتا ہوں اگر نسرین نے ریاض کا پیام دیا بھی تو میں فوراً نامنظور کر دوں گا۔ اسی طرح تمھیں ارشاد کے بارے میں فیصلہ کر لینا"

باب ۳

یہ کیا ہُوا؟

شام کا جھٹپٹا ہو چلا تھا، اپنی عالی شان کوٹھی کے خوشنما برآمدہ میں ایک مسند پر گاؤ تکیئے سے لگی، نسرین بیٹھی ہوئی تھیں سامنے پاندان رکھا تھا، اور وہ چھالیہ کتر رہی تھیں، سامنے ایک تپائی پر، رخسانہ بیٹھی اپنی پھوپھی سے باتیں کر رہی تھی، سامنے دالان تھا وہاں پڑوس کے کسی عزیز کے چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے، یہ بچے اپنے ماں باپ کی آنکھ بچا کر اس گھر میں اطمینان سے کھیلا کرتے تھے نسرین بیگم اس لیے ان کی دل شکنی نہیں کرتی تھیں کہ ان کے دم سے نداردنق رہتی ہے، نسرین نے پاندان اپنی طرف کھینچ کر پان بناتے ہوئے رخسانہ سے کہا،

"ریاض اب تک نہیں آیا!"

رخسانہ نے بے پروائی سے جواب دیا،

"آتے ہی ہوں گے!"

وہ بولیں،
"میرا تو دل ہَول رہا ہے!"
رخسانہ نے دلاسا دیتے ہوئے کہا،
"پھوپھی جان، آپ تو یونہی وہم کیا کرتی ہیں، آجائیں گے ابھی!"
نسرین نے کہا،
کچھ تجھے خبر بھی ہے، شہر کا کیا حال ہو رہا ہے؟ اب کسی مسلمان کی خیر نظر نہیں آتی، راہ چلتے چھرا بھونک دیتے ہیں تو نے کہہ دیا آجائیں گے یہاں میری جان پر بنی جا رہی ہے!"
یہ باتیں سنکر رخسانہ بھی ذرا پریشان ہوئی، لیکن اپنا دل سنبھال کر اس نے کہا،
"پھوپھی جان، یہ دلی ہے، ہندوستان کا دارالسلطنت، یہاں کچھ نہیں ہو سکتا، اور اگر ہوگا تو ساری دنیا چیخ اٹھے گی، آپ اطمینان رکھیے، بالکل نہ گھبرائیے، کسی دوست کے ہاں اٹک گئے ہوں گے بس اب آیا ہی چاہتے ہیں!
ایک بڑی لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر نسرین نے کہا،
اچھا بیٹی نہیں گھبراؤں گی، تو ان چھوکروں کی خبر لے، میں ذرا باورچی خانہ جاتی ہوں، ریاض کو شامی کباب بہت پسند ہیں، اپنے ہاتھ سے تلونگی!"
بڑے محبت بھرے لہجہ میں رخسانہ نے کہا،
"میرے ہوتے آپ کیوں تکلیف کریں گی میں جاتی ہوں تل دونگی۔"

خاموش رہتے؟ فرمایا، اور بڑے زور سے فرمایا،
"ہم تو خوب چیخیں گے!"
پھر زور سے نعرہ لگایا،

اللہ اکبر
قائدِ اعظم زندہ باد
لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان

ان نعروں میں ساتھ کی لڑکیوں نے بھی برابر کا حصہ لیا،
سامنے ایک کمرہ تھا، رخسانہ جب آتی تھی اسی کمرہ میں ٹھہرتی تھی وہ مسکراتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئی،

بچے بدستور شور کر رہے تھے، اتنے میں باہر سے ریاض آیا، آتے ہی اس نے ایک نظر گھر پر ڈالی، گویا کسی کی تلاش کر رہا ہے، پھر باورچی خانہ کی طرف گیا، وہاں نسرین بیگم اپنے چہیتے بیٹے کے لیے کباب تل رہی تھیں وہاں سے پلٹا تو بچوں کے جلسہ میں پہنچا، انھوں نے پروا بھی نہیں کی اپنے کام میں لگے رہے، ریاض نے پوچھا،

"رخسانہ کہاں ہیں؟"

لڑکے نے چپکے سے انگلی اٹھا کر کمرہ کی طرف اشارہ کر دیا، اور پھر اپنے کام میں لگ گیا، ریاض کمرہ کی طرف بڑھا، تو اس کے کانوں میں ایک دل کش نغمہ گونجا، یہ رخسانہ تھی، جو ایک آرام کرسی پر لیٹی ہوئی گا رہی تھی،

نسرین مسند سے اُٹھ چکی تھیں، انھوں نے رخسانہ کا سر اپنے کلیجے سے لگا لیا، اور دُعائیں دیتے ہوئے کہا،

"خدا تجھے سلامت رکھے، تو میری بیٹی ہے جو کام چاہوں، تجھ سے لوں، لیکن یہ کام میں ہی کر دوں گی"

پھر انھوں نے بچوں کے شور سے گھبرا کر کہا،

"دیکھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان لڑکوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے، سر میں درد ہونے لگا!"

نسرین بیگم باورچیخانہ چلی گئیں، رخسانہ مسکراتی ہوئی اس پنڈال کی طرف گئی، سب بچے اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے، رخسانہ نے سب سے مخاطب ہو کر کہا،

"خبردار جو اب شور کیا، پھوپھی جان کے سر میں درد ہو رہا ہے!"

بچوں میں سے ایک ننھی سی لڑکی بولی،

"آپا، اُن کے سر میں تو ہر وقت درد ہوا کرتا ہے!"

دوسری گڑیا بولی،

"ہمارا سر تو کبھی نہیں دُکھتا!"

تیسری چھوکری نے نسرین کی نقل کرتے ہوئے اپنا چھوٹا سا سر پکڑ کر کہا،

"اوئی، میں مری ہائے میرا سر گیا، یا اللہ!"

رخسانہ کو ہنسی آ گئی اس مجمع میں ایک صاحبزادے بھی تھے، وہ کیوں

اُٹھ کھڑی ہوئی، اور بولی،

"خدا نہ کرے، یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ موت کا بلاوا آئے آپ کے دشمنوں کو!"

اور پھر؛

رخسانہ سے ضبط نہ ہو سکا، بے ساختہ اس کے مُنہ سے نکل گیا،

"پھر میں جی کر کیا کروں گی؟"

ریاض، اور زیادہ بیقرار ہو گیا، اس نے کہا،

نہیں نہیں، یہ نہ کہو، میں تمھاری موت نہیں دیکھ سکتا، تمھیں بچانے کے لیے میں اپنی زندگی قربان کر دوں گا!"

رخسانہ نے سہمے ہوئے انداز میں کہا،

"ہے ہے، میرا تو دِل اُچھلنے لگا ——— لیکن ہوا کیا؟ کوئی دشمن چڑھا آ رہا ہے؟ خیر تو ہے؟"

ریاض نے جواب دیا،

"یہ دِلّی، اب ہماری دِلّی نہیں رہی، ہم اب دِلّی کے نہیں رہے!"

"آخر کیوں؟ کیسے؟"

"موت مسلمانوں کا پیچھا کر رہی ہے، انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈ کر قتل کیا جا رہا ہے؛ جس طرح جنگل میں جانوروں کا شکار کھیلا جاتا ہے اسی طرح دِلّی کے گلی کوچوں میں مسلمانوں کا شکار کھیلا جا رہا ہے!"

رخسانہ اس وقت کانپ رہی تھی اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا،

کوئی فریادرس مظلوم کا ہوتا تو کیا ہوتا
کسی بیکس کا بھی کچھ آسرا ہوتا تو کیا ہوتا
جب اس حالت پہ جینا کر دیا دوبھر خدائی کا
خدا ہی جانے وہ بت گر خدا ہوتا تو کیا ہوتا

ریاض دروازے سے باہر کھڑا ہوا، یہ نغمہ سُن رہا تھا، لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا، وہ اندر پہنچا، اسے دیکھ کر رخسانہ خاموش ہو گئی، ریاض نے ایک تاثر اور بیتابی کے عالم میں اس سے کہا،

"چپ کیوں ہو گئیں رخسانہ؟ گاؤ، خوب گاؤ، تمھاری صورت دیکھ کر ٹوٹا ہوا دل جڑ جاتا ہے، تمھاری مدبھری تانیں سُن کر زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے ——— رخسانہ میری فرمائش رد نہ کرو ——— خوب گاؤ، زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، نہ جانے کب موت کا بلاوا آجائے؟ کسی شاعر نے زندگی کو حباب سے تشبیہ دی تھی، لیکن میں کہتا ہوں، بلبلہ بھی ہندوستان میں مسلمان کی زندگی سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے، میں چاہتا ہوں جب موت آئے تو سر تمھارے زانو پر ہو، اور کانوں میں تمھارے شیریں نغمے گونج رہے ہوں!"

ریاض، رخسانہ سے محبت کرتا تھا، اسے نسرین بیگم بھی جانتی تھیں، اور رخسانہ بھی! کسی نہ کسی طرح اس کی محبت کی شراب کبھی کبھی اُبل ہی پڑتی تھی لیکن آج سے پہلے اس طرح اس انداز میں اس بیتابی کے ساتھ ریاض نے کبھی بھی رخسانہ سے باتیں نہیں کی تھیں، یہ باتیں سنکر وہ گھبرا گئی، جلدی سے

"ضرور چلنا چاہیئے، بشرطیکہ جاسکیں!"

"یہ کیوں؟ اس میں کیا مشکل ہے؟ دُنیا جارہی ہے"!

"بہت مشکل ہے، ناممکن ہے ——— ٹرینیں روک لی جاتی ہیں، آج ہی خبر آئی ہے، ایک ٹرین کی ٹرین امرتسر میں صاف کردی گئی عورتوں کو اغوا کرلیا گیا، ان کو بر سرِ عام بے آبرو کیا گیا انھیں ننگا ناچ ناچنے پر مجبُور کیا گیا، ان کے اعضا کاٹ ڈالے گئے، دُودھ پیتے بچّوں کی ٹانگیں چیر کر پھینک دی گئیں، بوڑھوں کی داڑھیاں خُون سے رنگ دی گئیں، جوانوں کی گردنیں کاٹ ڈالی گئیں،

اُف! ———

آہ! ———

"تمھارا خُدا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، مگر اپنے نام لیواؤں کو بچاتا نہیں"!

رُخسانہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی، اس نے کہا،

"ہائے میرے اللہ، اب آپ کفر بھی بکنے لگے، خُدا پر بھروسہ رکھیئے ہم انشاءاللہ خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں گے، میں پھوپھی کو جاکر بُلاتی ہوں، آپ سامان ٹھیک کیجئے، اس محلہ میں بھی رہنا ٹھیک نہیں، چلیئے سبزی منڈی چلیں، جب تک یہ بادل چھٹ نہیں جاتے، سب کو ایک ہی جگہ رہنا چاہیئے!"

"ہاں رُخسانہ ——— لیکن اب یہ بات بھی ممکن نہیں!"

بہت زیادہ سہم کر، رُخسانہ نے پوچھا،

"اور یہ پولیس؟ اور یہ فوج؟ اور یہ حکومت؟ اور یہ پنڈت نہرو
یہ گاندھی جی؟ یہ پٹیل صاحب؟ یہ سب کیا کر رہے ہیں؟"

ریاض نے کہا،

"یہ نہ پوچھو رخسانہ، یہ سب تماشہ دیکھ رہے ہیں، پولیس اور فوج
شہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ پنڈت جی بے بس ہیں، گاندھی جی
میں ہیں اور پٹیل صاحب خاموش ہیں ——— آج تو مجھ پر بھی حملہ ہو
زندگی تھی، بچ گیا، لیکن کب تک؟ کہاں تک؟"

رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، لیکن ضبط کر گئی،

"آپ پر؟ آپ پر حملہ ہوا؟"

ریاض نے کہا،

"ہاں! مجھ پر!"

"کب؟ کہاں؟ ہائے میرے اللہ، خدا کے لیے اب باہر نکلنا
کردیجئے کچھ دنوں کے لیئے!"

ریاض نے آستین اٹھا کر اپنا زخمی بازو دکھایا، چاقو کا چھپتا
زخم تھا، پٹی بندھی ہوئی تھی،

"یہ دیکھو"

رخسانہ کی آنکھوں سے رکے ہوئے آنسو ٹپک پڑے، وہ بولی
"واقعی اب ہندوستان میں رہنا ٹھیک نہیں، ابا سچ کہتے ہیں
پاکستان چلنا چاہیئے۔!"

"آپ گھبرایئے نہیں، زندہ وہی رہتے ہیں جو مرنا جانتے ہیں"—
"رخسانہ وہ سامنے میری بھری ہوئی رائفل رکھی ہے، اٹھانا!"
رخسانہ رونے لگی،
"میں نہیں لاتی، آپ یہیں بیٹھیے!"
بیگم نسرین نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا،
"کچھ دیوانہ ہوا ہے لڑکے؟ تیری ایک رائفل، ہزاروں رائفلوں کا کس طرح مقابلہ کرے گی؟ —— رخسانہ تو اپنے زیورات سنبھال، میں تجوری سے نوٹ نکالتی ہوں —— بقاتی! چور دروازے سے بھاگ چلنے کا بندوبست کر!"
ریاض نے کہا،
"لیکن میری اماں، بھاگ کر جاؤ گی کہاں؟ زمین سخت ہے، آسمان دور ہے، ہر طرف بلوائی بکھرے ہوئے ہیں، چوہے کی طرح مرنے سے شیر کی طرح مرنا اچھا ہے!"
ریاض نے لپک کر رائفل اٹھالی، اور کہا،
"بھاگنے کی کوشش بیکار ہے؟ کوٹھے پر چلو، اماں تم بھی، رخسانہ تم بھی، اگر میں تم کو نہ بچا سکا تو پہلے تم دونوں کو ہلاک کردوں گا، پھر اپنے گولی ماروں گا!"
یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں، اور باہر شور بڑھتا جاتا تھا، ہولناک اور لرزہ خیز شور، ریاض نے ماں سے کہا،

"یعنی ہم بستری منڈی بھی نہیں جا سکتے؟"

"نہیں!"

"یہ کیوں؟"

"کس طرف سے جائیں؟ سارا قرول باغ دشمن کا میدانِ جنگ بنا ہوا ہے، ابھی میں موٹر سائیکل پر آیا ہوں، جگہ جگہ، مسلح مجمع کھڑا ہے، تیور کہہ رہے ہیں، خون کا پیاسا ہے، صرف اشارہ کا منتظر ہے، ان کا حکم ہوا، اور یہ مسلمانوں پر چڑھ دوڑا، آج مجھے قرول باغ کی، یہاں کے مسلمانوں کی خیر نہیں نظر آتی، خدا رحم کرے!"

رخسانہ ابھی کوئی جواب نہیں دے پائی تھی، کہ بیگم نسرین ہانپتی کانپتی دوڑتی ہوئی آئیں،

"بیٹا یہ شور سن رہے ہو؟"

ریاض نے ایک لمحہ تامل کے بعد کہا،

"ہاں سن رہا ہوں؟ رخسانہ وہی ہوتا نظر آتا ہے جو میں نے ابھی تم سے کہا تھا!"

نسرین بیگم بولیں،

ابھی لقاقی باہر سے آیا ہے، وہ کہتا ہے ہمارے محلہ پہ ہندوؤں، اور سکھوں نے حملہ کر دیا، اب اس طرف ہمارے گھر کی طرف ریلا آرہا ہے، کیا ہوگا میرے اللہ؟"

نسرین بیگم رونے لگیں، ریاض نے کہا،

باب ۴

قیامت گزر گئی !

اور دلّی پر، دِلّی کے مسلمانوں پر واقعی قیامت گزر گئی، چشم فلک نے ایسے ہولناک مناظر کم دیکھے ہوں گے، اس سفاکی اور درندگی پر چنگیز اور ہلاکو کی روح نے شرما کر سر جھکا لیا، ہٹلر اور مسولینی کی رُوح نے فخر سے سر اونچا کر لیا،

گئے دن کہ تنہا تھی میں انجمن میں
مرے بزم میں رازداں اور بھی ہیں

اور ان رازدانوں نے بے گناہوں، اور معصوموں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا،

دلّی سات مرتبہ اُجڑ کر بس چکی ہے، دِلّی کئی مرتبہ گرم اور تازہ خون سے غسل کر چکی ہے، دِلّی کی سرزمین پر بارہا خون کے ندی نالے بہے ہیں، لیکن کیا اس طرح؟ سیکولر (غیر مذہبی) حکومت کے پایۂ

"جلدی کرو، وقت بالکل نہیں ہے، زیوروں اور نوٹوں کو چھوڑ دو. اُدھر چلو!"

شور اور بڑھ گیا، معلوم ہوتا تھا بلوائی کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہو گئے، شور اور بڑھ گیا، معلوم ہوا بلوائی گھر میں گھس آئے، شور اور بڑھ گیا اور واقعی بلوائی گھر کے اندر تھے،

ریاض، ماں، اور رخسانہ کو دھکیلتا ہوا، آگے بڑھا، اور صحن میں اپنی رائفل لے کر پہنچ گیا، نہ اس نے ماں کے روکنے کی پروا کی، نہ رخسانہ کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھے، وہ اس وقت دیوانہ ہو رہا تھا، اور اس کے کمرہ سے باہر نکلتے ہی شور اور بڑھ گیا!

شور بہت زیادہ بڑھ گیا!

شور!

دھماکا!

دھائیں دھائیں!

بم پھٹنے لگے!

گولیاں چلنے لگیں!

چھرے چمکنے لگے!

کرپانیں میان سے باہر نکل آئیں!

خون بہنے لگا!

اور پھر؟ ——————— !

قتل عام شروع کر دیا تھا، لیکن نظام دکن کے جدا علیٰ نظام الملک نے مظلوم مسلمانوں کی سفارش کی اور نادر شاہ نے ایک اداۓ تکبر کے ساتھ کہا،

بریشِ سفیدت بخشیدم

اور مسلمانوں کی جان بخش دی تھی، آج یہ سنہری مسجد، ویران و سنسان، پیکرِ حسرت بنی کھڑی تھی، اس میں کوئی نادر شاہ نہیں تھا، لیکن سامنے کے گردوارے میں بہت سے نادر شاہ بیٹھے تھے، ان کے ہاتھ میں تلوار کے بجائے کرپانیں چمک رہی تھیں، لیکن کوئی نظام الملک نہیں تھا، جو اپنی سفید داڑھی کا واسطہ دے کر مسلمانوں کو بچا سکتا، ان کی زندگی کی بھیک مانگ سکتا، ان کی سہاگنوں اور کنواریوں کی آبرو بچا سکتا، ———————

یہ ہمایوں کا مقبرہ ہے!

اسے جلال الدین اکبر نے بنایا تھا، تاکہ اس کا باپ حشر تک چین کی نیند سو سکے!

لیکن یہ مقبرہ آج خود میدانِ حشر بنا ہوا ہے، لٹے ہوئے، پٹے ہوئے تباہ حال، خستہ حال، دل شکستہ، اور بے سہارا مسلمانوں کے غول کے غول یہاں ہزاروں کی تعداد میں پناہ لینے کے لئے آ رہے ہیں، پناہ لینے یا ہمیشگی کی نیند سونے کے لئے؟

نہیں یہ مقبرہ، مسلمانوں کا مقبرہ بن سکتا ہے، انھیں پناہ نہیں دے سکتا، جب یہ بہادر شاہ کو پناہ نہیں دے سکا، تو بہادر شاہ کی قوم کو بھی پناہ نہیں دے سکتا، جنرل مٹکاف نے یہیں تو بہادر شاہ اور اس کے خاندان کو

تخت میں، سکھوں کی کرپانیں چمک رہی تھیں، سیوم سنگھیوں کے بم پھٹ رہے تھے، مسلمانوں نے اپنی کمزوری کے باوجود ان درا[ندازوں] دستیوں کا مقابلہ کیا، اور حریف کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن جب [نعرے] لگاتی ہوتی پولیس پہنچی، اور سنگین تانے ہوئے فوج کے جوان آئے تو مسلمانوں کا جی چھوٹ گیا، اور وہ بے سروسامانی کے عالم میں بھاگ نکلے، لیکن بھاگ کر جاتے کہاں؟ ہر طرف بلوائیوں کی یلغار ہو رہی تھی، ہر طرف سے گولیاں سنسناتی ہوئی نکل رہی تھیں، ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی، ہر طرف بم پھٹ رہے تھے، تلواریں اور کرپانیں چل رہی تھیں، شور، غل، ہنگامہ، فریاد، اور ان بھاگتے ہوئے مسلمانوں کا پشت پناہ کوئی نہ تھا، ان کا یاور اور مددگار کوئی نہ تھا۔

یہ مسلمان بھاگ رہے تھے!!

اور یہ شاہجہان کا بنایا ہوا لال قلعہ تصویر بنا خاموش کھڑا تھا! کبھی اس قلعہ سے مسلمانوں کے عساکر قاہرہ دشمن کی سرکوبی کے لیے نکلتے تھے، آج اس پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا، اور یہ قلعہ، اب شاہجہان [مغفور] کی قوم کا نہیں رہ گیا تھا!

یہ سنہری مسجد ہے!

کوتوالی سے ملی ہوئی، اور گردوارہ سیس گنج کے بالکل سامنے، اس مسجد کو بہت سی تاریخی کہانیاں یاد ہیں، اور سب سے بڑھ کر وہ جب نادرشاہ درانی یہاں ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا تھا، اور ایرانی لشکر نے مسلمانوں کا

ہلاک کردیا!

ہا! زمانہ کا انقلاب!

یہ مقبرہ زندہ لاشوں کو بھی پناہ نہیں دے سکتا!

یہ خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کی درگاہ سراپا انوار ہے!

یہ وہ درگاہ ہے جہاں بڑے بڑے شاہ اور شہنشاہ، میر سپاہ اور کج کلاہ، سر جھکا کر ادب سے پابرہنہ آتے تھے، امیر خسرو اسی درس گاہ فیض کے تربیت یافتہ تھے، وہی امیر خسرو، جن کے ہندی دوہے اور گیت، آج بھی بچہ بچہ کی زبان پر ہیں!

اس مقدس بستی میں اطراف و جوانب کے دہشت زدہ اور سراسیمہ مسلمانوں کا جمگھٹ لگا ہے، خواجہ حسن نظامی ٹیلیفون پر ٹیلیفون کر رہے ہیں، لیکن مسلح گارد کے بجائے، تلاشی لینے والے پولیس کے دستے پہنچتے ہیں جنھیں دیکھ کر اور زیادہ ہراس پیدا ہو جاتا ہے، خواجہ صاحب ابدی نیند سو رہے ہیں، اور ان کی بارگاہ میں پناہ کے طالب لرزاں و ترساں کھڑے ہوئے ہیں، لیکن کوئی لطیفہ، غیبی ظہور پذیر نہیں ہوتا، خدا کا عتاب جب نازل ہوتا ہے تو انہیں بھی پناہ نہیں ملتی، ——— !

لیکن کیا یہ خدا کا عتاب تھا! ——— کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

یہ مہرولی ہے!

یہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا مزار پر انوار ہے، یہاں کے ہندو مسلمانوں کو چھیڑنا نہیں چاہتے، لیکن جو چھیڑنے کے لیے باہر سے

گرفتار کیا تھا، اور پھر خاندان شاہی کے نوجوانوں کی گردن ماری تھی، آج پھر تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے، ایسا ہوتا آیا ہے۔ ایسا ہوتا رہے گا — یوں ہی ازل سے مرے یاد ہوتی آئی ہے!

یہ پرانا قلعہ ہے!

یہ کبھی کورو پانڈو کی رزمگاہ بن چکا ہے، پھر اس پر ہمایوں نے قبضہ کیا، اور اس کا نام "دین پناہ" رکھا، پھر شیر شاہ نے اس پر قبضہ کیا، اور ایک شاندار مسجد تعمیر کی، پھر یہ اکبر کے قبضہ میں آیا، اور حصول برکت کے لیے اس نے بھی ایک چھوٹی سی مسجد قلعہ کے پھاٹک سے باہر تعمیر کر کے اپنے حسن عقیدت کا ثبوت دیا، آج اس قلعہ میں کھلے آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر لاکھوں مسلمان پناہ پا لینے کی آس میں بیٹھے ہیں، موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، لیکن نہ خیمہ ہے، نہ خرگاہ، نہ کمرہ ہے نہ مکان، نہ کھانے کا انتظام ہے، نہ پانی کا بندوبست، نہ حکیم ہے نہ ڈاکٹر نہ روپیہ ہے نہ پیسہ، سب مرغی کی طرح دبکے ہوئے پڑے ہیں، صرف اس امید پر کہ جان بچ جائے گی، عافیت اور امن کی منزل یہیں سے شروع ہوگی!

یہ صفدر جنگ کا مقبرہ ہے!

یہاں کوئی مسلمان داخل نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ یہاں عافیت اور امن کی ذرا بھی امید نہیں ہے، صفدر جنگ کے اسپتال پر بھی بلوائیوں نے حملہ کیا، اور دق کے کئی مریضوں کو جن میں مرد بھی تھے، اور عورتیں بھی

یہ فیروز شاہ کا کوٹلہ ہے!

فیروز شاہ!۔۔۔۔۔ ہندوستان کا وہ فیروز بخت فرماں روا جس کے عدل و انصاف کی دھوم تھی، جس کی لاٹ تک سر اُٹھائے کھڑی ہے، جس کی مسجد اب تک کہنہ و شکستہ حالت میں موجود ہے، جس کی خانقاہ اب بھی موجود ہے!

لیکن یہ احاطہ اب آثار قدیمہ کی ملکیت ہے، اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے اگر مسلمان آثار قدیمہ بننے پر تیار ہوں، تو یہاں آسکتے ہیں، یہاں کا سبزہ زار یہاں کی ٹوٹی ہوئی عمارتیں، یہاں کے در و دیوار، انھیں پناہ دیں گے!

یہ دریا گنج ہے!

یہ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی ہے!

ہندوستان کا وہ مسیحا نفس رہنما، جس کے اخلاق، اور فیاضی، اخلاص اور حب وطن کے آگے سب کے سب جھکتے تھے، یہاں محمد علی نے قیام کیا تھا، یہاں شوکت علی نے بسیرا کیا تھا، گاندھی جی کا مستقل نشیمن یہی تھا، موتی لال اور جواہر لعل یہیں آکر مقیم ہوا کرتے تھے، مسز نائڈو، اور خالدہ ادیب خانم، اور رؤف پاشا، سب یہاں کے دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے، ڈاکٹر انصاری کا دل بہت بڑا تھا، اور دل سے بڑی ان کی جیب تھی، اور جیب سے بڑا ان کا دسترخوان تھا!

یہاں انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا، جس کا صدر تیج بہادر سپرو تھا، لیکن دفتر لوٹ لیا گیا، کتابیں جلا کر خاکستر کر دی گئیں ۔۔۔۔۔ کتب خانہ

آتے ہیں انھیں روک بھی نہیں سکتے، ایک ہندو انسپکٹر نے ضلع دامن کا ایڈیشن دیا، اور مسلمانوں کی حفاظت کا مردانہ وار ثبوت دیا، تو اس کے ہم قوموں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا، جو بپھری ہوئی قوم چند ماہ بعد دنیا کے بہت، اور اپنے سب سے بڑے آدمی —— گاندھی —— تک کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی، اس کے سامنے یہ ہندو انسپکٹر کیا چیز تھا!

مسلمانوں کی پٹائی یہاں بھی شروع ہوگئی، اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ درگاہ کی شکست و ریخت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، لیکن مسلمان خود ہی خستہ دور ماندہ تھے، وہ اس درگاہ کو یہاں کی مقدس عمارتوں کو کس طرح بچاتے؟

یہ قطب مینار ہے!

یہ مسجد قوت الاسلام ہے!

قطب الدین ایبک کے نقوش جمیل! ہاں، قطب الدین ایبک، سلطان شہاب الدین غوری کا غلام! ہاں شہاب الدین غوری، جس نے پرتھوی راج سے اس کا راج پاٹ چھینا تھا، اور جس کی کبریائی کا سارے ہندوستان میں ڈنکا بجنے لگا تھا۔

یہ نئی دلی ہے!

لیکن یہاں کوئی مسلمان نظر نہیں آتا، ان کے مکانوں پہ قبضہ ہو چکا، ان کی دکانیں لوٹی جا چکی!

اسکندریہ کا افسانہ، واقعہ کی صورت میں، مجاز حقیقت کے رنگ
میں!

یہ کوٹھی ڈاکٹر انصاری کی لڑکی، اور داماد کو بھی پناہ نہیں دے سکی، اپنے وطن، اپنے شہر اور اپنے گھر میں انھیں پناہ نہ ملی، ایک ہوٹل نے عارضی طور پر اپنے دروازے ان کے لیے کھول دیے اور یہ ادھر آگئے!

کوچۂ چیلاں ہے!

ہندوستان کو جذبۂ آزادی سے سرشار کرنے والے محمد علی کا مسکن آصف علی، ہند کے سفیر امریکہ کا نشیمن! مولانا احمد سعید، فرماں
جمعیۃ علما کا وطن!

آگ کی لپٹیں، اور خون کی لہریں یہاں تک بھی پہنچیں، اور مسلمان سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے لگے!

یہ جامع مسجد ہے!

جو کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی جوان ہے، یہاں مولانا ابوالکلام تقریر فرما رہے ہیں، کبھی یہاں وہ نمازی وضو کرتے اور نماز پڑھتے تھے، جو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے!

تم آج موت سے ڈر کر بھاگ رہے ہو؟

لیکن موت کا ڈر، خدا کے ڈر سے زیادہ تھا، مولانا کے الفاظ نہتے مسلمانوں میں مرنے کا جذبہ نہ پیدا کر سکے، وہ زبانِ خاموش

کہتے تھے، مرنے کا جذبہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب مارنے کی استعداد بھی ہو!

یہ چاندنی چوک ہے!

یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا، لیکن کبھی! ——— اب نہیں! مسلمانوں کی دکانوں پر تالے پڑے تھے اور وہ تالے، اب ہتھوڑوں سے توڑے جا رہے تھے، مال لوٹا جا رہا تھا، اور دکانوں پر قبضہ کیا جا رہا تھا!

یہ قرول باغ ہے!

جامع ملیہ کا صدر مقام، اور مکتبۂ جامعہ کا موجودہ صدر دفتر، جس کے بے داغ نیشنلزم پر ابھی کچھ دن ہوئے، راج گوپال اچاری، اور جواہر لال خطبہ دے چکے تھے، لیکن راج گوپال اور جواہر لال کی پولیس اور فوج، مکتبۂ جامعہ کو بھی نہ بچا سکی، اس کی عمارت لوٹ لی گئی، اور لاکھوں روپیہ کا اسٹاک جلا دیا گیا، کتابیں پھاڑ ڈالی گئیں،

یہ قرول باغ میں، ندوۃ المصنفین کا دفتر ہے!

مولانا حفظ الرحمٰن، ناظم جمعیۃ علماء تصنیفی ادارہ، اس ادارہ کو بھی اس کا نیشنلزم نہ بچا سکا، اس کی کتابیں بھی جلا دی گئیں، کاغذ پھاڑ ڈالا گیا، اسٹاک لوٹ لیا گیا، فرنیچر توڑ ڈالا گیا، اور یہاں کے کارکن، بے سروسامانی کے عالم میں، اپنی خود اعتمادی کا نوحہ پڑھتے ہوئے پناہ گزین کیمپ کی طرف بھاگ نکلے!

مسلمانوں کا گڑھ، لڑنے والے اور کٹ مرنے والے مسلمانوں کی آماجگاہ! سنگھ کے سورماؤں نے یہاں پوری قدرت سے حملہ کیا، لیکن مسلمانوں نے پسپا کر دیا، جتنے مسلمان شہید ہوئے، اس سے کہیں زیادہ حملہ آور کھیت رہے، حملہ آور بار بار شکست کھا کر بھاگتے تھے، اور پھر تازہ دم ہو کر آتے تھے، اور جب ان میں مقابلہ کی سکت نہیں رہی، تو فوج اپنے تمام سازو سامان سے لیس ہو کر آگئی مسلمان آتشیں اور ہلاکت آفریں، اسلحہ کا مقابلہ کہاں تک کرتے؟ پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری جب تک دم رہا مقابلہ کرتے رہے، اور آخر کار ان کے پائے استقامت میں بھی لغزش آگئی، اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف جان اور آبرو لے کر وہ بھی بھاگنے پر مجبور ہو گئے!

یہ حاجی ستار کی قلعہ نما کوٹھی ہے!

لیکن اب یہ فوج کے قبضہ میں ہے، یہاں کا سازو سامان بھی برباد ہو چکا، مال اور اسباب لُوٹا جا چکا اور یہاں کے رہنے والے؟ یہاں کے رہنے والوں میں کوئی نظر نہیں آتا، مر گئے؟ زندہ ہیں؟ بھاگ گئے؟ کچھ نہیں معلوم، لیکن کوٹھی کے دروازے پر، یہ نیم عریاں لاش کس کی پڑی ہے؟ یہ ہیں حاجی عبدالستار کی اہلیہ محترمہ جو بڑھاپے میں بھی پردے کی بڑی سختی سے پابند تھیں۔ کیا بُرا تھا، اگر یہ گھر کے اندر مرتیں، ان کی بے گور و کفن لاش وہیں سے اُٹھائی جاتی، لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا، قدرت شاید ان مرحومہ کے ساتھ بہت سے بڑے اور چھوٹے

یہ قرول باغ واقع، طبیّہ کالج ہے! یہ طبیّہ کالج کی شاندار عمارت ہے، یہ طبیّہ کالج کا شاندار ہوسٹل ہے، یہ طبیّہ کالج کا شاندار ہسپتال ہے،
اجمل خان اعظم کی یادگار!

وہ اجمل خان جنکی بارگاہ میں جھک کر گاندھی جی آتے تھے، جس کے سامنے جوہر لال نے کبھی سر اٹھا کر بات نہیں کی، جس کی بارگاہ فلک پایگاہ تک ولبھ بھائی پٹیل کا گزر نہیں تھا!

ہاں تو، یہ طبیّہ کالج، اب مسلمانوں کا نہیں رہا، یہ اب شرنارتھیوں کا ہے، وہ جو سلوک چاہیں، اس کے ساتھ روا رکھیں ——————
جو گناہ کیجیے، ثواب ہے آج!

اس قرول باغ میں، مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا، جو بھاگ سکتے تھے، وہ بھاگ گئے، جنھیں راستہ نہ ملا، وہ یہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے گئے!

یہ بیگم نسرین کی کوٹھی ہے!
سراپا شعلہ وخاکستر، کوئی مکین نظر نہیں آتا، ایسا معلوم ہوتا ہے موت کا پنجہ بڑھا، اور ایک ہی وار میں سب کو لے گیا، اگر یہاں کچھ نظر آتا ہے، تو تازہ خون کے بڑے بڑے دھبے، دیواروں پر بھی، اور فرش پر بھی!

یہ سبزی منڈی ہے!
سبزی منڈی! بہادر راعیوں کا مرکز، تجارت پیشہ

نہیں تھا!

اور یہ پروفیسر نیاز کا خوبصورت مکان ہے!

فساد سے دو دن پہلے نیاز، اور ریحانہ حاجی ستار کے گھر سے یہاں آ گئے تھے، اور بہن کے ساتھ سلطانہ بھی آ گئی تھی، وہ بہن سے کہنے لگی رخسانہ پھوپھی کے ہاں گئی ہے، تم اپنے گھر جا رہی ہو، اماں مجھے کچا چبا جائیں گی، رخسانہ ہوتی تو ان کی نوک جھونک ہم دونوں آدھی آدھی بانٹ لیتے میں اکیلی یہ وار نہیں سہہ سکتی، اور ریحانہ نے سلطانہ کا ہاتھ پکڑا، اور اپنے ساتھ پہاڑ گنج لے آئی،

نیاز کے مکان میں ہو کا عالم تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، یہاں بھی بڑے زور کا رن پڑا ہے، کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، لیکن کسی کا سر غائب تھا، کسی کے مختلف اعضاء، لاشوں کے اس ہجوم میں بقائی کی اکڑی ہوئی گردن صاف نظر آ رہی تھی، معلوم ہوتا ہے اس نے سبزی منڈی میں مرنا، گوارا نہ کیا، پہاڑ گنج میں آ کر جان دی، موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا، اس مکان پر، یہاں کے در و دیوار پر!

اور یہ موت کا سناٹا صرف اس مکان پر نہیں، دلّی کے ہر مسلمان گھر پر چھایا ہوا تھا، ہر مسلمان گھبرایا ہوا تھا، جہاں حملہ ہوا تھا وہاں بھی، جہاں حملہ ہونے والا تھا وہاں بھی، اور جہاں لبظاہر حملہ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا، وہاں بھی، — — ہر جگہ، ہر طرف! حد نگاہ تک!

دلّی کئی مرتبہ خون میں نہائی، لیکن ایسا خونی غسل اسے کبھی

لوگوں کو، بلکہ ایک پُوری قوم کو بے پردہ، اور بے نقاب کر دینے کا فیصلہ کر چکی تھی، اور قدرت کے فیصلہ میں کون مداخلت کر سکتا ہے؟

یہ پہاڑ گنج ہے!

سبزی منڈی کے بعد، دِلّی کے مسلمانوں کا سب سے مضبوط قلعہ!

یہ قلعہ بڑا مستحکم تھا، ناقابلِ شکست! ناقابلِ تسخیر!

یہاں کے مُسلمان تعداد میں کم تھے، لیکن بڑے مضبوط تھے، بڑے جیالے بڑے دلاور، اور بہادر! ساتھ ساتھ مال دار بھی! یہ ان کی شاندار عمارتیں یہ ان کی شاندار مسجدیں، یہ ان کی آسمان کو چھُونے والی حویلیاں، یہ ان کی خوش نما، اور خوش منظر کوٹھیاں!

یہاں بھی پوری شدّت کے ساتھ حملہ ہُوا، اور یہاں کے مسلمانوں نے بھی پُوری شدّت، اور جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کیا، ایسا مقابلہ کیا کہ حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیئے، لیکن چھُری تلوار کا، پٹاخہ بم کا نقلی بندوق رائفل اور مشین گن کا، مقابلہ نہیں کر سکتی جب تک فوج نہیں آئی تھی، حملہ آوروں کو زبردست نقصان اُٹھانا پڑا، اور جب فوج آگئی تو بھگدڑ مچ گئی، مسلمانوں نے اپنا سب کچھ چھوڑا، اور بھاگے۔ بھاگنے کے بعد بھی انھیں امان نہ ملی، سنسناتی ہوئی گولیوں اور چمکتی ہوئی تلواروں نے ان کا استقبال کیا، دھوئیں اور آگ کے اس طوفان میں وہ بہتے ہوئے چلے، کچھ ڈُوب گئے، کچھ رہ گئے، کچھ کنارے پہنچ گئے، جو کنارے پہنچے وہ بھی زندہ تھے، لیکن مُردہ سے بدتر، سانس چلتی تھی، لیکن زندگی کے امن کا کہیں پتہ

باب ۵

پُرانا قلعہ!

دِلّی کے مسلمان پناہ گزینوں کی پہلی منزل، جامع مسجد تھی جہاں جہاں سے مسلمانوں کو بھاگنا پڑا، وہ سیدھے یہیں پہنچے!

مُلّا کی دوڑ مسجد، اور خانماں برباد مسلمان کی دوڑ جامع مسجد! مقامی مسلمانوں سے بہت پہلے جامع مسجد کے پاس کا علاقہ اُردو بازار، میواتیوں سے پٹا پڑا تھا، اب مقامی مسلمانوں نے آکر رونق اور بڑھا دی تھی، مرگ انبوہ جشنے دارد! گاندھی جی نے یہیں آکر ان کے دِل پر پھاہا رکھا تھا، مسلمانوں نے آپس میں چندے کرکے دیگیں پکوائیں، اور بے سروسامان مسلمانوں میں تقسیم کیں، بہت ایسے تھے جو بھوک کی شدّت سے مجبور ہو کر، کہنی مار کر آگے بڑھتے تھے، اور اپنا حصّہ لیتے تھے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن پر کڑاکے کے فاقے گزر رہے تھے، بھوک سے نڈھال اور بے حال ہو رہے تھے

نہیں نصیب ہُوا تھا، جیسا اب ہُوا!

لیکن کیا مجال جو دستِ طلب کسی طرف بڑھادیں، خاموش، پُر سکون جیسے یہ بیمار ہیں بھوکے نہیں۔

جامع مسجد، زیادہ دنوں تک، ان مہمانوں کی مدارات نہیں کر سکی گاندھی جی کے مشورہ سے حکومت نے، پُرانا قلعہ مسلمانوں کے لئے کھول دیا، اور اعلان کردیا کہ تمام پناہ گزیں وہاں پہنچ جائیں، عبادت گاہوں سے پناہ گاہوں کا کام نہیں لیا جا سکتا!

جامع مسجد مسلمانوں سے خالی ہوگئی، لیکن چاندنی چوک، دریبہ فیض بازار، دریاگنج، سبزی منڈی، پہاڑ گنج، قرول باغ، نئی دلی اور دوسرے بہت سے مقامات کی مسجدوں پر، شرنارتھیوں نے قبضہ کرلیا انھوں نے ان مسجدوں میں، اقامت اختیار کی، پوجا پاٹ کا سلسلہ شروع کردیا، بُت بھر لا کر رکھدیئے گئے، اور صنم پرستی کا پھر چرچا ہونے لگا، یہ بت انہی تین سو ساٹھ بتوں کے رشتہ دار تھے، جو کعبہ سے نکالے گئے تھے، آج پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی، مسلمانوں سے سیکڑوں مسجدیں چھین چکی تھیں، اور ان میں بتوں کے لئے جگہ پیدا کی جارہی تھی، آغا حشر نے کبھی زورِ سخن میں کہدیا تھا، ——— طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں! ——— اور آج واقعۃً ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یا مسلمان قوم خُدا کو چھوڑ چکی ہے، یا خدا نے مسلمانوں سے ناتا توڑ لیا ہے ——— می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

دونوں صورتوں میں سے جو بھی ہو، نتیجہ ایک ہی تھا!

پُرانے قلعہ کے وسیع اور کشادہ میدان میں اتنے آدمی بھر گئے کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں، ہزارہا مسلمان، اور پانی کا ایک چھوٹا سا نل اسی چھوٹے سے نل سے اِن اَن گنت مسلمانوں کو نہانا تھا، وضو کرنا تھا کھانا پکانا تھا، انسانی ضروریات پوری کرنی تھیں، پانی کی اس قلت کا نتیجہ یہ ہُوا کہ العطش العطش کی صدائیں بلند ہونے لگیں، لیکن لوگوں کو چیخنے کی آزادی تھی، پانی پینے کی آزادی نہیں تھی، شیرشاہ سوری کی مسجد کے احاطہ میں امیر حبیب اللہ خاں مرحوم فرماں روائے افغانستان کا بنوایا ہُوا ایک چھوٹا سا کنواں موجود تھا، لیکن اب وہ بھی سُوکھ چکا تھا کسی کہنے والے نے سچ ہی کہا ہے کہ تاریکی میں سایہ بھی جُدا ہوتا ہے انساں سے، یعنی اپنے بھی پرائے بن جاتے ہیں! آدمیوں کا اتنا بڑا میلہ، عورتوں اور لڑکیوں کا جمِ غفیر، بچّوں، اور بوڑھوں اور بیماروں کا یہ ہجوم بے پایاں لیکن پاخانہ ایک بھی نہیں، دن ہو یا رات، دُھوپ ہو یا بارش، ضرورت مند لوگ مجبور تھے کہ اس کھُلے میدان میں جہاں نہ کوئی درخت تھا نہ جھاڑی رفع حاجت کریں، دیکھنے والوں میں سے جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر لے یا مُنہ پھیر لے، لیکن لوگ اپنے احتیاجات پورے کرنے پر مجبُور تھے، آخر کہاں جاتے؟ کیا کرتے؟

یہ لوگ جو پُرانے قلعہ میں ڈیرا ڈالے بیٹھے تھے، کرپانوں، اور مشین گنوں سے بچ گئے تھے، لیکن ہیضہ، اور دوسری وبائی بیماریوں کو عام اجازت تھی کہ آئیں، اور اپنا کام شروع کریں، محکمہ حفظانِ صحت کے لوگ پھاوڑے گینج،

تھے، ان میں پردہ نشین عورتیں بھی تھیں، ناسمجھ بچے بھی تھے، اپاہج اور معذور بوڑھے تھے، اور یہ سب لگاتار بھیگ رہے تھے۔

اور اس رم جھم بارش میں کہیں پکوان پک رہا تھا، ملاریں گائی جا رہی تھیں، باغوں میں جھولے پڑے تھے، اور پتنگ بڑھائے جا رہے تھے، کوئی رو رہا تھا، کوئی ہنس رہا تھا!

ایک تصویر کے دو رُخ!

اور دلی کے قدیم ہندو باشندے نگاہ حیرت اور چشم عبرت سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، انھیں ان تباہ حال مسلمانوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ صدیوں سے دونوں ایک شہر اور ایک محلّہ میں رہتے چلے آئے تھے، آپس میں میل جول تھا، گہرے روابط تھے۔ لیکن وہ بے بس تھے کیا کرتے؟ کیا کر سکتے تھے؟ اپنے پردیسی اور ظالم بھائیوں کا ہاتھ پکڑنے کی ان میں طاقت نہیں تھی، اگر وہ ایسا کرتے تو انھیں بھی مسلمان قرار دے دیا جاتا، اور پھر انھیں بھی ہمایوں کے مقبرہ یا پُرانے قلعہ میں جانا پڑتا، جو سلوک جھرولی کے ہندو انسپکٹر پولیس کے ساتھ اس کے ہم مذہب ہندو بھائیوں نے کیا تھا، وہی سلوک دلی کے ہندوؤں کے ساتھ بھی اُن کے ہم مذہب بھائی روا رکھ سکتے تھے جو گولی کسی ایک آدمی پر چل سکتی ہے، وہ کسی ایک جماعت یا گروہ پر بھی چل سکتی ہے!

پُرانا قلعہ، میدان حشر کا نمونہ معلوم ہوتا تھا، وہی نفسا نفسی کا عالم

اور دُوسرے مقامات کی بے گور و کفن، سڑی لسی، لاشیں اُٹھا رہے تھے سڑکوں پر سے خُون کے دھبے مٹا رہے تھے، اور یہاں بہت سے لوگ مرنے پہ تُلے ہوئے تھے، گویا حفظانِ صحت کے لوگ بیکار نہ بیٹھنے پائیں وہاں سے اُٹھیں اور یہاں چلے آئیں ——— کبھی اس گھر میں آ نکلے کبھی اُس گھر میں جا نکلے!

قدرت جب ستم ظریفی پر آتی ہے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی، ایک طرف تو یہ عالم تھا، دوسری طرف موسلا دھار بارش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اس کُھلے میدان میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی، جہاں سر چھپایا جا سکتا، اور اگر ہوتی بھی تو وہ ان ہزارہا ہزار آدمیوں کا معاون کیونکہ بن سکتی تھی؟ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے، لیکن اتنی نہیں کہ وہ جادو کے محل تیار کر سکے، یہ کرشمہ تو صرف علاء الدین کے چراغ میں تھا،

علاء الدین کا چراغ!

حقیقت سے افسانہ کی طرف گریز!

افسانہ سے حقیقت کی طرف فرار!

ہاں تو نہ علاء الدین ملا، نہ اس کا چراغ، نہ پلک جھپکاتے کوئی محل بن سکا، پانی اسی طرح رم جھم برستا رہا، اور پناہ گزیں اسی طرح، بارانِ رحمت سے فیضیاب ہوتے رہے،

ایک تصویر کے دو رُخ!

پناہ گزیں مسلمان بھیگ رہے تھے، بھیگ بھیگ کر تر آلود ہو رہے

دیکھتے تھے، اور آہ کر کے آسمان کی طرف تکنے لگتے تھے کہ شاید کوئی دُوسرا طیارہ روٹیوں سے بھرا ہُوا آرہا ہو، وہ آتا تھا، روٹیاں بھی ساتھ لاتا تھا، لیکن ان کی بھُوک کا علاج کسی کے پاس نہیں تھا، اگر تھا تو روپے کے پاس، اور یہاں وہ معاملہ کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

اسی عالم کش مکش و اضطراب میں، بچھڑے ہوئے باپ بیٹی، اور بھائی بہن مل گئے،

بیگم نسرین اور حاجی عبدالستار!

حاجی عبدالستار اور رخسانہ! ——!

بہن نے بھائی کو دیکھا، بیٹی نے باپ کو دیکھا، اور اُس شخص نے جو بہ یک وقت بھائی بھی تھا، اور باپ بھی، اپنی بہن اور بیٹی کو دیکھا، کسی کی زبان سے کچھ نہ نکلا، صورت تصویر خاموش کھڑے، ایک دُوسرے کو دیکھ رہے تھے، مگر ایسے موقع پر آنکھیں اپنا کام کیے بغیر نہیں مانتیں، سب کی آنکھوں سے گنگا جمنا کی تراوش ہو رہی تھی،

نسرین نے پوچھا،

بھابی کہاں ہیں؟

اور بھائی کی لرزتی ہوئی آواز نے کہا،

"قتل ہوگئیں!"

بیہوش ہوتے ہوتے پھر انھوں نے سوال کیا،

"اور ریحانہ؟"

وہی کس مپرسی کی کیفیت، دوستوں کی رفاقت، عزیزوں کی چاہت، اپنوں کی محبت! ———— سب کا جنازہ نکل چکا تھا، ہر شخص یہ چاہتا تھا، پانی پہلے مجھے ملے، روٹی پہلے میرے ہاتھ آئے، جو ایک دوسرے کی مصیبت دیکھ کر بے کل ہو جاتے تھے، وہ اب ایک دوسرے کو مصیبت سے بے کل دیکھتے تھے، مگر منہ پھیر لیتے تھے، اپنے پانی کا گلاس، اپنی روٹی کا ٹکڑا، وہ کسی کو کسی قیمت پر بھی نہیں دے رہے تھے،

پھر پاکستان کی مدد، امداد غیبی کی صورت میں پہنچنے لگی، سامان خورد و نوش سے بھرے ہوئے طیارے، کراچی سے دلی پہنچنے لگے، کم از کم پیٹ کی طرف سے اطمینان ہوا، ایں ہم غنیمت است!

پھر دلی سے طیارے، کراچی کو پرواز کرنے لگے، ریل کا راستہ ناممکن تھا، سمندر تک پہنچ آسان نہ تھی ہوا کا راستہ کھل گیا، لیکن بادِ ہوائی ثابت ہوا!

پاکستان سے آئی ہوئی روٹیاں گراں قیمت پر بکنے لگیں، جن کے پاس پیسے تھے وہ دونوں وقت کھانے لگے، جو سب کچھ لٹا کر یہاں آئے تھے، ان کے ایک وقت کا سہارا بھی چھن گیا، طیاروں میں پاکستان کے سرکاری ملازمین کو بھی وہ سہولت، اور ترجیح نہیں ملی، جو فدایانِ پاکستان اور جانِ اسلام، رنڈیوں کے حصہ میں آئی، یہاں وہ پری وش تھیں، جو طیاروں میں اُڑ کر پری بن گئیں، لوگ سامان خورد و نوش کو بکتے ہوئے

پہنچا، وہ قتل ہو چکی تھیں، مجھے پستول چلانے کا موقعہ نہ ملا، کسی نے پیچھے سے کرپان ماری، سر پر زخم آیا، میں تیورا کر گرا، اور بیہوش ہو گیا، نہ جانے کے دن ہسپتال میں رہا، آج ہی یہاں پہنچایا گیا، دیکھ رہی ہو نا، پٹی بندھی ہے، ابھی زخم بالکل اچھا نہیں ہوا!"

رخسانہ نے ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے کہا،

"اور کبھی کچھ سُنا ہے آپ نے؟"

حاجی صاحب بیٹی کا مُنہ دیکھنے لگے، معلوم ہوتا تھا، وہ ہر خبر سُننے کے لیے تیار ہیں، لیکن رخسانہ آگے کچھ نہ کہہ سکی، اس سے کچھ نہ کہا گیا، بوڑھوں میں جوانوں سے زیادہ سکت ہوتی ہے، آخر بیگم نسرین نے رخسانہ کی بات پُوری کی،

"ریاض بھی لاپتہ ہے!"

حاجی صاحب گرتے گرتے بچے،

"کیا کہا ریاض؟"

رخسانہ نے روتے روتے جواب دیا،

"جی!"

بیگم نسرین نے وفورِ عقیدت سے آنکھیں بند کرکے عالمِ تصوّر میں ریاض کو اپنے سامنے دیکھ کر کہا،

"میرا لال، میرا بیٹا!"

پھر وہ بولیں،

"پہاڑ گنج میں تھی، کچھ نہیں معلوم زندہ ہے یا مر گئی!"

رخسانہ سے ضبط نہ ہو سکا، اس کا گریہ گلوگیر ہو رہا تھا لیکن اس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھا،

"اور میری سلطانہ آپا!"

بوڑھے حاجی کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا، فساد سے کچھ پہلے نیاز نے اسے بھیج دیا تھا لیکن

"وہ چھین لی گئی!"

رخسانہ اور زور سے چیخی،

"میری آپا!"

بوڑھے نے کہا،

"ہاں تمھاری آپا! ـــــــ وہ بہادر تھی، امید ہے اب مر چکی ہوگی ـــــــ جب تمھاری ماں کو قتل کیا گیا، میں زخمی ہو کر بیہوش ہو چکا تھا، جب ہوش میں آیا تو یہاں تھا، اور سلطانہ کہیں نہیں تھی!"

بوڑھے حاجی نے قدرے توقف کے بعد کہا،

"وہ سچی تھی، وہ بہادر تھی، اس نے مجھ سے اپنی ہیرے کی انگوٹھی دکھلاتے ہوئے کہا تھا، یہ مجھے بے آبرو ہونے سے بچائے گی، اور پھر جب بلوائی ہمارے گھر میں گھس آئے تو میں نے دیکھا وہ نگینہ نکال کر منہ میں رکھ چکی تھی، اتنے میں تمھاری ماں کی چیخ کی آواز آئی، میں پستول لے کر باہر

"نہیں نہیں، وہ مرا نہیں، وہ زندہ ہے، وہ زندہ رہے گا، وہ مجھ سے اور بھیا سے بھی زیادہ عمر پائے گا، ابھی اس نے دنیا کا دیکھا کیا ہے؟ میں اس کی شادی کروں گی، اسے دولھا بناؤں گی، اس کے سر پہ سہرا باندھوں گی، ایسی دھوم دھام سے شادی کروں گی کہ دوست شاد ہوں گے، اور دشمن ناشاد!"

یہ کہتے کہتے بیگم نسرین نے آنکھیں کھول لیں، ریاض سامنے نہ تھا، بچوں کی طرح بلبلا کر رونے لگیں، حاجی صاحب سے پوچھا،

"میرا بھیا چاند کہاں ہے؟"

حاجی صاحب اپنا غم بھول گئے، وہ ریاض کو بہت چاہتے تھے، اگرچہ اپنی چاہت کا اظہار بیوی کے ڈر سے نہیں کرتے تھے، لیکن اب بیوی کا ڈر ختم ہو چکا تھا، اب ان پہ کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا، انھوں نے بڑے عزم و یقین کے ساتھ کہا، اور یقین دلایا،

"ریاض زندہ ہے ——— ممکن ہے یہاں ہو، ممکن ہے ہالیوں کے مقبرے میں، ممکن ہے کہیں اور، لیکن میرا دل کہتا ہے، وہ زندہ ہے، نسرین! میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا، تم فکر نہ کرو، نہ رو میری بہن!"

اور بیگم نسرین نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ لیے، آج شاید وہ زندگی کے راز کا تہیہ کر چکی تھیں، زرسانہ کو سینے سے چمٹاتی ہوئی بولیں،

"مجھ سے اس کی حالت نہیں دیکھی جاتی، کسی نے اس کا نام لیا اور

یہ پھُوٹ پھُوٹ کر رو دی ــــــــــــ بھیّا، رخسانہ اب تمھیں نہیں ملے گی وہ ریاض کی ہو چکی!"

حاجی صاحب نے کہا،

"رخسانہ سے ریاض مجھے زیادہ عزیز ہے!"

"رخسانہ کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی، اور پھر تینوں گھاس کے ایک تختہ پر بیٹھ گئے،

اس کئی دن کے بعد ایک روز حاجی صاحب، نے پروفیسر نیاز کو، ئی کے پاس قطار میں لوٹا ہاتھ میں لیے کھڑا دیکھا، انھوں نے آواز دی،

"نیاز!"

اور نیاز انھیں دیکھتے ہی قطار سے باہر آگیا، حاجی صاحب نے پوچھا،

"سب خیریت ہے؟"

اور جواب سننے سے پہلے ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، فوراً ہی دوسرا سوال کیا،

"ریحانہ کہاں ہے؟"

نیاز نے کہا،

"یہیں ہیں، چلیئے!"

نیاز حاجی صاحب کو لے کر، قلعہ کی ٹوٹی ہوئی فصیل کے پاس پہنچا، ایک پھٹی ہوئی چٹائی پر میلا سا برقعہ اوڑھے، اور میلے کپڑے پہنے، ریحانہ بیٹھی تھی، سامنے انگیٹھی رکھی تھی، اور وہ کھچڑی پکانے کی کوشش

"اس ٹوٹی ہوئی فصیل کے پیچھے بیٹھنے سے پیٹھ ٹکانے کا موقعہ بھی مل جاتا ہے، دھوپ ہو تو کچھ دیر کے لئے سایہ بھی میسّر آجاتا ہے، یہیں سے آیئے رُخسانہ کو اور پھوپھی کو!"

حاجی صاحب نے اس رائے سے اتفاق کیا، اور نیاز کو ساتھ لے جا کر بہن اور بیٹی کو لے آئے، یہاں آنے کے بعد پھر صف ماتم بچھی، رخسانہ اور ریحانہ ایک دوسرے کے گلے مل کر بہت روئیں، بیگم نسرین پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے،

یہ لوگ قلعہ میں رہ رہے تھے، یہاں سے باہر نکلنے یا پاکستان جانے کی کوئی صورت اب تک نہیں نکلی تھی، نیاز اپنی پروفیسری کا زمانہ، اور حاجی صاحب اپنی سرمایہ داری کا دَور فراموش کر چکے تھے، فرش خاک پر بیٹھنا، موٹا جھوٹا کھانا، کبھی فاقہ کر لینا، یہی صبح و شام تھی، اسی طرح زندگی بسر ہو رہی تھی، لیکن نیاز، اس مصیبت کی زیادہ تاب نہ لا سکا، اسے پیچش ہو گئی اور وہ سخت بیمار ہو گیا،

اب سب سے بڑا سوال نیاز کے علاج، دوا، اور پرہیز کا تھا، بیگم نسرین کے سارے زیورات، اور نوٹ لوٹ لیئے گئے تھے، ریحانہ کے بدن پر چند زیورات تھے، باقی سب کچھ پہاڑ گنج ہی میں رہ گیا، حاجی صاحب اپنے ساتھ کچھ بھی نہ لا سکے تھے، وہ پرانے خیال کے آدمی تھے، اور پرانے خیال سے زیادہ مذہبی شخص تھے، بینک چونکہ سودی کاروبار کرتا ہے اور وہ ہر قسم کے سود کو حرام سمجھتے تھے، لہٰذا انھوں نے بینک میں روپیہ رکھا ہی

کر رہی تھی، باپ کو دیکھتے ہی ریحانہ بیقرار ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی،

"میرے ابّا، ابّا جان!"

وہ آ کر پاس بیٹھ گئے،

"ہاں بیٹی میں آ گیا، تجھے دیکھ کر، مجھے کتنی خوشی ہوئی، میں کہہ نہیں سکتا!"

ریحانہ نے پوچھا،

"رخسانہ پھوپھی کے پاس تھی، اس کا کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں وہ یہیں ہے، اپنی پھوپھی کے پاس!"

وہ بولی،

"پھوپھی اور ریاض آ گئے یہاں؟"

صرف پھوپھی، ریاض نہیں! ——— اس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہاں ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ نسرین صرف اتنا بتاتی ہے وہ اپنی رائفل لے کر بلوائیوں میں گھس گیا تھا، پھر اس کا پتہ نہیں چلا

پھر ریحانہ نے ماں، اور سلطانہ کے بارے میں پوچھا، حاجی صاحب نے نہایت ضبط سے کام لے کر، پھر ساری کتھا سنا ڈالی، نیاز اور ریحانہ رونے لگے، حاجی صاحب، اس صدمہ کو جھیل چکے تھے، انھوں نے صبر کی تلقین کی، اور کہا،

"چلو تم لوگ بھی وہیں چلو، جہاں ہم ٹھہرے ہیں!"

ریحانہ نے کہا،

نیاز کی دوا دارو کے انتظام میں لگ گئے،

کئی دن اور گزر گئے، لیکن نیاز کو افاقہ نہ ہوا، بلکہ مرض زور پکڑتا گیا، اب نیاز کو یہ دُھن سوار تھی کہ کس طرح پاکستان کے سفر کا انتظام ہو، نیاز کا بھائی امتیاز دہرہ دون میں فوجی ٹریننگ لے رہا تھا، اس نے بہت سے دوسرے مسلمان ساتھیوں کی طرح ہندوستان کی خدمت پر پاکستان کی خدمت کو ترجیح دی تھی، نیاز کا خیال تھا، امتیاز کو فوراً یہاں آنا چاہیئے، یہاں سے ہم سب کو لے کر طیارے میں پاکستان چلنا چاہیئے! نیاز نے کئی تار دیئے، مگر کوئی جواب نہیں آیا، دہرہ دون میں اب تک امن تھا، اور نہ بھی ہوتا تو بھی امتیاز ایسی جگہ تھا، جہاں تک فساد اور کشت و خون کے شعلے نہیں پہنچ سکتے تھے، لہٰذا اس کی خیریت کے بارے میں تو اطمینان تھا، لیکن اس کی "نالائقی" اور "بے پروائی" پر رہ رہ کے غصہ آتا تھا، لیکن غصہ کا اظہار کس پر ہوتا؟ عضو ضعیف ریحانہ تھی، وہی اپنے زندہ دل، اور ہنس مکھ شوہر کے چڑچڑے پن کا شکار بنتی، لیکن مجال ہے، جو اس نے کبھی اپنے بیمار شوہر کی تیمار داری یا خدمت میں کوتاہی کی ہو، یا اُلٹ کے کوئی جواب دیا ہو، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بڑی سعادت مند بیوی تھی، فساد سے پہلے وہ اپنے شوہر پہ خوب حاوی تھی، خوب لڑتی، اور شوہر کو ہمیشہ اس کے سامنے سپر ڈالنی پڑتی تھی، لیکن اب وہ اس کی حالت دیکھ رہی تھی، اس کی پریشانی سمجھ رہی تھی، اس کی بے بسی سے واقف تھی، وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی

نہیں، وہ اپنی تجوری کو بنک سمجھتے تھے، سارا اندوختہ مع خانگی زیورات کے اسی میں تھا، اور اب صورت حال یہ تھی کہ تجوری کی چابی حاجی صاحب کے پاس تھی، اور تجوری پر ایک سکھ کا قبضہ تھا، جو کرتہ اور شیروانی وہ پہنے تھے، اس میں سونے کے ٹھوس بٹن لگے تھے، یہی آخری پونجی تھی، انھوں نے سوچا، انھیں بیچ کر کچھ روپیہ حاصل کریں، اور اس سے نیاز کا علاج کرائیں،

قلعہ کے دروازے پر، ایک بوڑھا سکھ، روز جھولی میں روپے بھر کر آتا تھا، یہ راولپنڈی کا رہنے والا تھا، اور اپنا تمام سامان منقولہ اپنے ساتھ لایا تھا، بنک میں جو روپیہ تھا، وہ اس نے ۱۵ اگست سے پہلے ہی دہلی میں منتقل کرالیا تھا، یہ سکھ، قلعہ کے تباہ حال مسلمانوں کے زیورات خریدا کرتا تھا، روپیہ کی قیمت چار آنے لگاتا تھا، لیکن سونے چاندی کی قیمت زندگی سے زیادہ تو نہیں ہوتی، لوگ مجبوراً اونے پونے زیورات فروخت کرکے جو کچھ ملتا تھا، صبر شکر کرکے لے لیتے تھے، حاجی صاحب کے بٹن ہزار روپیہ سے کسی طرح کم نہیں ہوں گے، لیکن سکھ مہاجن سو سے چل کر سوا سو پر، پھر سوا سو سے پھر ڈیڑھ سو پر، پھر پونے دو سو پر، اور آخر میں دو سو پر آکر اڑ گیا کہ اس سے زیادہ ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا، حاجی صاحب لاکھ لاکھ گڑگڑائے، انسانیت اور آدمیت کا واسطہ دیا، لیکن زمین جنبد نہ جنبد گل محمد! وہ ٹس سے مس نہ ہو، آخر حاجی صاحب نے مجبور ہو کر، بٹن دے دیئے، اور دو سو روپے لے کر چلے آئے، اور

رخسانہ نے کہا،

"ابا میاں کئی دن سے ریل کے ٹکٹ کی کوشش کر تو رہے ہیں، اب نہ ملے تو وہ بیچارے کیا کریں؟ آج پھر گئے ہیں!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حاجی صاحب، تھکے، ماندے تشریف لائے، نسرین نے پوچھا،

"کیوں بھیا کچھ ہوا؟"

ریحانہ اور رخسانہ امید بھری نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگیں نیاز نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ٹکٹکی لگا دی، حاجی صاحب کی طرف کہ دیکھیں یہ کیا کہتے ہیں؟

حاجی صاحب نے کہا،

"بڑی مشکل سے بندوبست ہوا ہے، لیکن"

نسرین نے پوچھا،

"اب کیا بات ہے بھیّا؟"

حاجی صاحب بولے،

"کم سے کم، سفر کے لیے دو سو روپیہ چاہیئے، اور میرے پاس صرف پچاس روپے ہیں، کل صبح اسپیشل چھوٹ رہی ہے، اگر آج ٹکٹ نہ لیئے گئے تو پھر کئی دن تک کسی گاڑی کے جانے کی امید نہیں ہے!"

یہ سنتے ہی ریحانہ نے گلے سے سونے کا ہار اتارا، اور باپ کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی،

تھی، اس کا یہ حال دیکھ کر وفورِ محبت سے وہ رو دیتی، لیکن ڈرتی نہیں
تھی رد کھٹی نہیں تھی،

نیاز کی یہ حالت دیکھ کر اس نے کہا،

"تم تو خواہ مخواہ ہوا سے لڑتے ہو، ممکن ہے امتیاز نے خط بھیج
دیا ہو، لیکن تمھیں نہ ملا ہو، یہاں قلعہ میں خط آنے سے رہا، کالج نہ تم جا سکے
ہو نہ وہاں کا کوئی یہاں آتا ہے، گھر برباد ہو چکا، آخر امتیاز کا خط تمھیں کیسے
مل جائے؟"

نیاز نے کہا،

"پھر کیا کیا جائے؟"

ریحانہ بولی،

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امتیاز بالا بالا ڈیوٹی پر بلا لیا گیا ہو اور وہ پاکستان
پہنچ بھی چکا ہو!"

نیاز نے کہا،

"مانتا ہوں، جو کچھ کہہ رہی ہو، قرین عقل ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ
یہاں کب تک موت سے پنجہ لڑاتے رہیں! آخر پاکستان جانے کی کوئی صورت
نکلے گی یا نہیں؟"

بیگم نسرین بولیں،

"میرا دل کہتا ہے، ریاض بھی وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ گیا، اگر پاکستان
جانے کی کوئی صورت نکل آئے تو وہ ضرور مل جائے گا، میرا یوسف ثانی

باب ۶

پُر درد کہانی

مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر زندگی حرام ہو چکی تھی، دِلّی کا سہاگ لُوٹا جا چکا تھا، ہندوستان کے بعض دُوسرے بڑے شہروں میں بھی بڑے وسیع اور منظم پیمانے پر قتل و غارت کا بازار گرم تھا، مسلمانوں کے قدم اُکھڑ چکے تھے، انھیں دیہاتوں سے کریدا جا رہا تھا، انھیں شہروں سے پاکستان کی طرف دھکیلا جا رہا تھا، دیہات کے مکھیا کہتے تھے، پاکستان بن گیا، اب یہاں کیا کر رہے ہو جاؤ وہاں؟ شہر کے تاجر، اور حکام فرماتے تھے اب پاکستان کیوں نہیں جاتے؟ مسلمان اپنے مکان بیچنا چاہتے تھے، دُکان فروخت کرنا چاہتے تھے، جائداد کا سودا کرنا چاہتے تھے مگر کوئی گاہک نہیں ملتا تھا، جب یہ سودے کی بات چیت کرتے تھے تو انھیں جواب ملتا تھا، ہم اپنی چیز کیوں خریدیں! تمھیں جانا ہے ہی، آج نہیں تو کل جاؤ گے، تو یہ دکان

"ابا میاں اسے بیچ ڈالیئے!"

حاجی صاحب کی آنکھوں میں ہار دیکھ کر آنسو بھر آئے، یہ ان کی
بیوی کا ہار تھا، جسے انھوں نے ریحانہ کو عطا کر دیا تھا، ان کی آنکھوں
آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے، بڑی دیر تک وہ ہار کو الٹ پلٹ کے
رہے، پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور سیدھے سکھ مہاجن کے
پہنچے، جو آج بھی حسب معمول قلعہ کے دروازہ پر جھولی میں روپیہ بھ
مسلمانوں کے زیورات سستے داموں خرید رہا تھا!

سکھ نے ہار پر ایک نظر ڈالی، اسے کسوٹی پر کسا، اور کہا،

"اس کے تین سو روپے دے سکتا ہوں، اس سے زیادہ نہیں

حاجی صاحب اگر بحث کرتے تو یقیناً وہ ساڑھے تین سو پچاس روپے اد
دیتا، لیکن وہ اس ہار کو جلد از جلد اپنی نظروں سے اوجھل کر دینا
تھے یہ ان کے ہاتھ میں تھا، اور ان کی بیوی کا نقشہ ان کی آنکھ
بسا تھا، جب وہ ان کے گھر میں دلھن بن کر چودھویں کے چاند کو
ہوئی آئی تھیں، اور یہی ہار ان کے زیب گلو تھا، ان کی آنکھوں میں
آنسو بھر آئے انھوں نے چپکے سے ہار سکھ کی طرف بڑھا دیا، اور وہ
سے نوٹ نکال کر گننے لگا!

مکان، کھیت، باغ، گاؤں، اپنے سر پر رکھ کر نہیں لیجاؤ گے، غرض ایک عجیب کس مپرسی کے عالم میں مسلمان زندگی بسر کر رہے تھے، نہ رہ سکتے تھے نہ بھاگ سکتے تھے ــــــــــ نہ ٹھہرو جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے!

امتیاز دہرہ دون میں، فوجی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا، وہ بڑا پکا مسلم لیگی تھا اور بڑا پکا ہندوستانی بھی تھا، وہ ہندوستان کے پسینہ پر خون بہانا باعث سعادت سمجھتا تھا، اسے ہندوستان کے متعصب، تنگ دل اور ناروادار کانگریسی اور غیر کانگریسی لیڈروں سے نفرت تھی، لیکن اس کے دل میں ہندوستان کی محبت اور عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، اس نے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانے کا تہیہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ پاکستان کی طرف سے بہ نوک شمشیر، ہندوستان کو فتح کرنا چاہتا تھا، اس کے دل میں صرف یہ بات تھی کہ پاکستان ایک نئی مملکت ہے، اسے نئے خون، نئے آدمیوں اور نئے ماہروں کی ضرورت ہے، ہندوستان ایک قدیم مملکت ہے، اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ہندوستان سے اگر کچھ ماہرین پاکستان چلے جائیں تو ہندوستان کا کچھ نہیں بگڑے گا، اور پاکستان کا کام بن جائے گا، آخر ہندوستان اور پاکستان کی فوج، اور سول سروس میں سیکڑوں ہزاروں انگریز موجود ہیں، کیا یہ انگریز اپنے ملک کے دشمن بن کر ہندوستان پاکستان آئے ہیں؟ پھر اگر ہندوستان کے کچھ ماہر پاکستان میں، اور پاکستان کے ماہر ہندوستان میں اقامت اختیار کرلیں یا ملازمت

کریں، تو ان کا حب وطن کیوں زیر بحث آئے؟ انھیں غدار، اور بے وفا کیوں سمجھا جائے؟ وہ اپنے نظریہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا تھا لیکن اس کے منچلے غیر مسلم دوست اس کا مذاق اڑاتے تھے، مخالفت کے آگے، دلیل اور منطق کے اسلحہ کام نہیں دیتے، اختلاف کا مرحلہ دلیل و منطق سے طے ہو سکتا ہے!

لیکن جب مشرقی پنجاب کے زہرہ گداز مظالم کی داستان انتہا تک پہنچی تو اس کا دل ہل گیا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سوچنے لگا، اس دیس میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ اگر ہر وہ شخص چلا گیا جو جا سکتا ہے تو وہ لوگ کیا کریں گے جو نہیں جا سکتے، بالآخر ان مسلمانوں کا بھی کوئی پاسبان ہوگا یا نہیں؟ انھیں زندہ رہنے، انھیں زندہ رکھنے اور ان میں زندہ رہنے کے لیے بھی تو کوئی ہونا چاہیے، یہ سوچ کر اس نے اپنا پہلا فیصلہ بدل دیا، اور طے کر لیا کہ وہ پاکستان نہیں جائے گا، ہندوستان میں رہے گا، ہندوستان کی خدمت کرے گا، اور ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ زندہ رہے گا یا مرے گا، اسے معلوم تھا پاکستان میں اس کا مستقبل زیادہ درخشاں اور تابناک ہے، ہندوستان میں ترقی اور کامگاری کے امکانات محدود، اور مسدود ہیں، پھر بھی، اس نے اپنی ذات پر اپنی قوم کو ترجیح دی، اور میجر اچاریہ سے جا کر اپنے خیال کا اظہار کر دیا، وہ خوش ہوئے، انھوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا،

"شاباش —— میں تمہارے اس فیصلہ سے بہت خوش ہوا ہمیں

یہ آل انڈیا ریڈیو ہے! ——————

آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جلسے ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، چراغاں کی تیاریاں کی جا رہی ہیں، بچے خوش ہو رہے ہیں کہ اسکول سے چھٹی ملی، نوجوان خوشی سے بے قابو ہوئے جا رہے ہیں کہ قربانیوں کا پھل ملا، بوڑھے خوشی میں جھوم رہے ہیں کہ سو برس کی غلامی کا دور ختم ہوا، در و دیوار پہ خوشی کا پرچم لہرا رہا ہے، کوچہ و بازار میں مسرت کے ترانے گائے جا رہے ہیں، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی، اچھوت، سب خوش ہیں، خوشی کے جوش سے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں، ہندوستان آزاد ہوگا، ہر شخص کا عقیدہ تھا لیکن دفعتہً آزاد ہو جائے گا، اس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا،

آج لال قلعہ پر سو برس کے بعد آزادی کا جھنڈا لہرایا جائے گا پرچم کشائی کی رسم ہندوستان کے وزیراعظم، اور کاروانِ آزادی کے آزمودہ کار سالار پنڈت جواہر لال نہرو، خود اپنے دستِ مبارک سے انجام دیں گے، یہ منظر دیکھنے کے لیے خلقت ٹوٹی پڑ رہی ہے، کھوے سے کھوا اچھل رہا ہے، تھالی پھینکیئے تو سر ہی سر جائے، مرد، عورت، بوڑھے، بچے، تندرست، بیمار، بیکار، باکار سب ہی چلے پڑ رہے ہیں، آج ہندوستان آزاد ہے، زندہ باد ہندوستان!

ہوشیار باش —————— پنڈت جی نے پرچم کشائی کی رسم ادا کردی، اب وہ تقریر کر رہے ہیں!

یہی کرنا چاہیے تھا، تم نے فیصلہ اگرچہ دیر میں کیا ہے، اور تمھارے کاغذ ملٹری ہیڈ کوارٹر کو بھیجے جا چکے ہیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں، میں تکنیکی خامیوں کے باعث اس معاملہ کو الجھنے نہیں دُوں گا، اور تمھاری سر... یہیں منتقل کرا لوں گا، تم مطمئن رہو، جاؤ اپنا کام کرو۔"

میجر اچاریہ کی باتوں سے امتیاز بہت خُوش ہُوا، یہ میجر صاحب ... کے رہنے والے تھے، بالکل غیر متعصب، بہت زیادہ فراخ دِل، ا... بے انتہا رواداد ——— برائے کینۂ اغیار در اُلم جانبست ——— پُورے طور پر ان پر صادق آتا تھا، ان کی جگہ، اگر میجر ... ہوتے تو شاید اس آسانی سے کام نہ بنتا،

میجر اچاریہ سے رخصت ہو کر، امتیاز سیدھا ہوسٹل آیا، تمام ... اس وقت ہال میں جمع تھے، کمیشنڈ اور نان کمیشنڈ افسران بھی، اور فوجی تربیت حاصل کرنے والے طلبہ بھی، سب ہی جمع تھے، اور سراپا اشتیاق بنے ہوئے تھے، امتیاز بھی جا کر اس مجمع میں شریک ہو گیا، اس نے اپنے ایک سا... سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"لال قلعہ پر قومی جھنڈا لہرایا جا رہا ہے، اس کا آنکھوں دیکھا حال آل انڈیا ریڈیو سے ریلے ہو رہا ہے سُنیے!"

امتیاز سُننے لگا، دفعتہً ایک بلند آواز فضا میں گُونجی!

ہم دِلّی سے بول رہے ہیں ———

آئے تھے؟"

"ٹوٹے ہوئے لیکن سچے دل سے!"

شنکر نے سگریٹ کا ایک زوردار کش لگایا اور کہا،

"مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے، لیکن یہ ٹوٹا ہوا دل تم کراچی کیوں نہ لے گئے؟ وہاں یہ پھر سے جُڑ سکتا ہے، سمجھے؟"

امتیاز نے ذرا خفگی کے لہجہ میں کہا،

"نہیں سمجھا، نہ سمجھ سکتا ہوں!! تم بے وقوف لوگوں کی باتیں صرف سُنی جا سکتی ہیں، سمجھی نہیں جا سکتیں!"

شنکر نے ایک قہقہہ لگایا،

"خفا ہوگیا میرا یار — کیوں؟ ———— تم تو اب بالکل اپنے قائدِ اعظم کی طرح چڑچڑے ہوتے جاتے ہو!"

"پھر وہی، اب یہ دُوسری بات آپ نے ارشاد فرمادی، کچھ کہونگا تو کوئی اور نیا طعنہ ایجاد کر لوگے!"

شنکر ہنسنے لگا،

"بڑے واہیات آدمی ہو، آج رُوٹھے رُوٹھے سے کیوں ہو؟ کسی سے لڑ کر آئے ہو کیا؟"

امتیاز نے شنکر کا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور آگے بڑھا،

"میرا خیال تھا، آزادی حاصل کرنے کے بعد پچھلی تمام باتیں فراموش ہو جائیں گی، اور ایک نیا دَور شروع ہوگا!"

اور پھر پنڈت جی کی تقریر شروع ہوئی، سارا مجمع انگشت بدنداں تھا، تقریر کیا تھی؟ جادو تھی، ایسی اثر انگیز، اور معرکہ آرا تقریر پنڈت جی نے اپنی زندگی میں مشکل سے ہی کی ہوگی، یہ تقریر ایک محبّ وطن کی تقریر تھی، جس میں صفائی، اور سادگی کے ساتھ آزاد ہندوستان کے آزاد باشندوں کو آزاد رہنے کے گر بتلائے گئے تھے، اور ان ذمہ داریوں سے آشنا کیا گیا تھا، جن سے ایک آزاد قوم، اور آزاد ملک کو لازمی طور پر عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔

امتیاز نے یہ تقریر بڑے غور اور توجّہ سے سُنی، وہ آج بہت خوش تھا، وہ خوشی خوشی اپنے کمرہ میں واپس جا رہا تھا کہ شنکر سے مڈبھیڑ ہو گئی یہ دونوں پُرانے دوست تھے، اور اختلاف فکر و نظر کے باوجود ایک دُوسرے کے اخلاص، اور شرافت کے قائل تھے، امتیاز پہلے کانگریسی خیال کا تھا، پھر مسلم لیگی بن گیا، شنکر پہلے کانگریسی خیال کا تھا، پھر سوشلسٹ ہوگیا، لیکن نہایت سچّا اور کھرا،

شنکر نے امتیاز کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا،

"اماں راستہ بھُول گئے تھے کیا؟ اِدھر کیسے آ نکلے؟

امتیاز نے جواب دیا،

"پنڈت جی کی تقریر سُننے ــــــــــــــــ حُضور کا کیا مطلب تھا، نہ آتا؟"

"نا بھائی یہ مطلب کیوں ہوتا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ کس دِل سے

مسلم اکثریت کے ساتھ وفادار رہے، اور مسلم اقلیت ہندو اکثریت کے ساتھ وفادارانہ برتاؤ رکھے، مسلم اکثریت ہندو اقلیت کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرے، اور ہندو اکثریت مسلم اقلیت کے ساتھ ——————
اکثریت کہیں اقلیت نہ بنے، اور اقلیت کہیں اکثریت نہ بننے پائے، یہ تھا، سیدھا سادھا اصول جسے ہم نے اپنایا تھا، لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اقلیت کہیں بھی عزت، اور آبرو، امن اور عافیت کے ساتھ نہیں رہ سکے گی، صرف اکثریت ہی کا بول بالا ہوگا ہر جگہ!"

"آج تم یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟"

"تم ان باتوں کی واقفیت اور اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے شنکر"

"کیوں؟ ——— کیوں نہیں سمجھ سکتا؟"

"تم تو ہال میں موجود تھے، بتاؤ حاضرین کا کیا عالم تھا؟ فوج کو سب سے زیادہ غیر متعصب ہونا چاہئے، لیکن ہمارے فوجیوں کا کیا رنگ تھا؟

منہ سے آپس میں باتیں کرتے ہوئے جو بول نکل رہے تھے، کتنے جچے تلے تھے، پھر بھی ان کی کڑواہٹ کتنی نمایاں تھی؟ اور میں؟ میں ایک گوشہ میں کھڑا، باتیں سن رہا تھا، اور دنگ تھا، میرے پاس دلی سے خطوط آتے رہتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ ہندوؤں کے اور خاص کر پنجاب سے آئے ہوئے سکھوں کے کیا خیالات ہیں، کیا ارادے ہیں؟"

"کیا ہیں بتاؤ؟"

"ہاں ٹھیک ہے، یہی ہوگا!"

"لیکن مجھے یہ ہوتا نظر نہیں آتا، مغربی اور مشرقی پنجاب کے درد انگیز شعلے سارے ملک میں پھیلتے جا رہے ہیں، اور ان کی لپیٹ اب دلی تک پہنچنے لگی ہے، اس ملک میں، اور اس شہر میں مجھے مسلمانوں کا مستقبل نہایت تاریک نظر آرہا ہے!"

"آخر کیوں؟ یہ ملک جتنا کسی اور کا ہے اتنا ہی تمھاری قوم کا بھی ہے، میں تو کہتا ہوں تقسیم ہند کا سب سے اچھا پہلو یہ ہے کہ اب ہند میں وہی لوگ رہ گئے جو سچے اور کھرے ہندوستانی ہیں، دوسرے لوگوں نے اپنا الگ وطن بنا لیا، اور وہ اب وہاں مگن ہیں!"

"بالکل ٹھیک، لیکن یہ تم کہہ رہے ہو، ہندوستان کی اکثریت نہیں کہتی، ہندوستان کے بااقتدار لوگ نہیں کہتے، یہاں کے عوام نہیں کہتے"

"کہتے ہیں، اور نہیں کہتے تو انھیں کہنا پڑے گا!"

"مشکل ہے شنکر، حالات بہت ابتر ہو چکے ہیں ——— تم جانتے ہو، میں مسلم لیگی تھا، اور ہوں، لیکن زندگی کے کسی دور میں بھی اپنے وطن کا غدار نہیں تھا، بیشک ہمیں اکثریت سے کچھ شکایات تھیں، کچھ ہمارے مطالبات تھے، ہم یہ چاہتے تھے کہ جس علاقہ میں جو اکثریت ہے وہ حکومت کرے، جو اقلیت ہے وہ وفاداری کے ساتھ رہے، ہم اگر یہ چاہتے تھے کہ پنجاب، بنگال، سندھ وغیرہ میں مسلمان حکومت کریں، تو ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ مدراس، بمبئی، بہار، سی پی، وغیرہ میں ہندو حکومت کریں، ہندو اقلیت

تو فوراً دبا دیا جائے گا!"

امتیاز کو شنکر کی ان باتوں سے کچھ تسلی ہوئی، وہ مطمئن سا نظر آنے لگا، شنکر نے کہا،

"کہئے، اب کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین، بیچ اس مسئلے کے کہ دلی میں فساد ہوگا یا نہیں؟"

امتیاز مسکرا دیا،

شنکر نے کہا،

"یار چلو، کسی دن منصوری کی ہوا کھائیں، ذرا طبیعت بہلے!"

"چلوں گا، جب جی چاہے چلو!"

شنکر نے کہا،

"وہاں سیوائے ہوٹل میں ٹھہریں گے، اور اس قتالۂ عالم، روبی سے بھی ذرا ہنس بول لیں گے، جو مجھ پر جان دیتی ہے، اور تم پر تھوکتی بھی نہیں ہے!"

امتیاز نے ایک قہقہہ لگایا،

"مجھ پر کہ تم پر؟ میری تو وہ دعوتیں کرتی ہے، مگر میں اسے منہ بھی نہیں لگاتا، صرف تمھاری خاطر سے دعوت قبول کر لیتا ہوں، کہ تنہا تمھیں تو بلائے گی نہیں، میرے طفیلی بن کر چلو گے!"

"اچھا بھئی یہی سہی ——— چلیں گے بہر حال!"

"تو کون منع کرتا ہے، چلو ہم ساتھ ہیں!"

شنکر چلا گیا، اس کے جانے کے بعد، امتیاز کو دلی سے ایک خط ملا

"بتاؤ کیا کروں، دیکھ لو گے چند روز میں!"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ دلی میں بھی خون کی ندیاں بہیں گی اور

بھی فساد ہوگا؟"

"ہاں، میرا مطلب یہی ہے!"

"تو تم بالکل بے وقوف ہو، عقل سے خالی، فہم سے عاری!"

امتیاز شنکر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا، شنکر نے مج

سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا، اور کہا،

"ممکن ہے تمہارا خیال کسی حد تک صحیح ہو لیکن جہاں تک دلی

تعلق ہے بالکل غلط ہے۔"

"کیوں غلط ہے؟"

"ارے بے وقوف، اول تو ہندو مسلم تعداد وہاں تقریباً مساوی ہے

بلکہ میواتی پناہ گزینوں نے کچھ اور بڑھا دی ہے، دوسرے وہاں

ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی دشمنی نہیں، تیسرے، دلی، ہندوستان

دارالحکومت ہے، پٹیل اور نہرو کا پایۂ تخت ہے، غیر ملکی سفیروں

قونصلوں کا مرکز ہے، غیر ملکی اخبارات کے نامہ نگاروں، اور وقا

نویسوں کا صدر دفتر ہے، وہاں کا چیف کمشنر مسلمان ہے، تم سمجھتے ہو وہاں

فساد ہوگا، اور حکومت خاموشی سے دیکھتی رہے گی؟ اور اس طرح سار

دنیا کے سامنے اپنے ہاتھوں اپنے منہ پہ کالک لگائے گی؟ ایسا ہو

سکتا ہے کہیں؟ بالکل اطمینان رکھو، وہاں فساد ہرگز نہیں ہو سکتا، اور اگر

زندہ رہ سکتی ہے کہ وہ ہزار جانیں رکھتی ہو، اور بار بار مر کر زندہ ہونے کے فن سے واقف ہو،

خط بند کر کے وہ ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا، اور عالم خیال میں دہلی پہنچ گیا، سلطانہ سامنے آئی اور اس سے باتیں ہونے لگیں، بڑی بڑی آنکھیں، خوبصورت چہرہ، زلف رسا کمر تک لٹکتی ہوئی، باتوں میں ایک خاص کشش، وہ امتیاز کو دیکھ کر مسکرائی، امتیاز اسے دیکھ کر مسکرا دیا،

تم نے دیکھا، ہم نے دیکھا، اک فسانہ بن گیا!

یہ فسانہ اسی طرح تصور ہی تصور میں بنتا، اور بڑھتا چلا جا رہا تھا، کہ کسی کی آہٹ ہوئی، اور کمرہ میں کوئی ہنستا ہوا، قہقہہ لگاتا ہوا پہنچ گیا، امتیاز نے آنکھ کھول کر دیکھا، تو مہتا چاریہ کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے موجود تھا وہ بھی امتیاز کا بے تکلف دوست تھا، اس نے کہا،

"پریشان کیوں نظر آتے ہو؟ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

وہ ایک افسردہ تبسم کے ساتھ اسے دیکھنے لگا،

اس نے کہا،

"یوں ہی ——— آؤ شطرنج کھیلیں!"

شطرنج کی بساط بچھ گئی، اور دونوں بڑے انہماک و استغراق سے کھیل میں منہمک ہو گئے، ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ امتیاز جیتتا تھا، اور مہتا چاریہ مسلسل ہارتا تھا، آج امتیاز مسلسل ہار رہا تھا، اور زندگی میں پہلی مرتبہ اناڑی چالوں کے باوجود مہتا چاریہ جیت رہا تھا، جیتے جا رہا

یہ اس کے ایک بچپن کے ساتھی نے لکھا تھا۔

شنکر کی باتوں سے امتیاز کسی حد تک مطمئن ہو
تھا، لیکن خط پڑھتے پڑھتے اس کے اطمینان کی دنیا پھر سُونی ہو گئی، ا
آشفتہ خاطری میں کچھ اور اضافہ ہو گیا، خط میں لکھا تھا، پنجاب سے آئے
سکھوں کی گالیاں سننا اور خاموش رہنا، ان کی غضب ناک آنکھوں کو د
اور چپ رہنا، ان کے خطرناک ارادوں کو سننا اور کچھ نہ کر سکنا، یہ
ہماری زندگی، ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ سکون جو آج نظر آ رہا ہے، وہ
طوفان سے پہلے سمندر میں نظر آتا ہے، میں دیکھ رہا ہوں یہ شرنا
نگاہوں سے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں، ان کی مسجدوں اور گھروں اور د
کو دیکھ کر غصہ، نفرت، اور انتقام کے جذبہ سے ان کا چہرہ تمتما جا
وہ گالیاں بکنے لگتے ہیں، اور اپنے ارادوں کا فاش و برملا اعلان کر
لگتے ہیں، پر یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ امن قائم رکھنے والی پولیس ان
حوصلہ افزائی کر رہی ہے، اور سب کو ایک نگاہ دیکھنے والی فوج
سپاہی بھی امن سوز لوگوں کے یار غار بنے ہوئے ہیں حکومت کے
اور ادنیٰ حکام، مسلمانوں کو حقارت۔ ذلت اور نفرت کی نظر سے
رہے ہیں، اور شر انگیز، اور فتنہ خیز عناصر کی سرپرستی کر رہے ہ
شنکر کی باتوں سے امتیاز کو جو اطمینان ہوا تھا، یہ خط دیکھ کر
فراموش ہو گیا، اور وہ سوچنے لگا جس ملک کی اکثریت کا یہ حا
جس ملک کی حکومت کی یہ کیفیت ہو، وہاں اقلیت صرف اس

تھا، آخر بازی اُٹھ گئی، دونوں دوست آمنے سامنے بیٹھ کر سگر
پینے لگے،

اتنے میں ریڈیو خبریں سُنانے لگا، اناؤنسر کی آواز آئی،
"ایک مسلمان ممبر کے اعلان وفاداری کے جواب میں سردار
نے کہا، میں اسے باور نہیں کر سکتا کہ ایک ہی رات میں مسلمان
جائیں گے، اور وہ جنھوں نے تقسیم کا گھاؤ لگایا
ایک ہی دن میں سچے، اور وفادار ہندوستانی بن جائیں

بھٹاچاریہ نے کہا،
"سُنا آپ نے؟"
امتیاز بولا،
"ہاں سُن رہا ہوں، یہ ارشادات!"
بھٹاچاریہ بولا،
"اب یہاں مسلم لیگیوں کا گزر نہیں ہو سکتا"
امتیاز نے جواب دیا،
"میرا تو خیال ہے، یہاں اب مسلمانوں کا ٹکنا مشکل ہے!"
بھٹاچاریہ بولا،
"تمھیں کیا، تم تو پاکستان جا ہی رہے ہو، ہندوستانی رہے کب
امتیاز نے بپھر کر کہا،
"ہرگز نہیں، ہم پاکستان کے دوست ہیں، ہمدرد ہیں، اس کی

تعمیر میں ہم نے حصّہ لیا ہے، لیکن وہ ہمارا وطن نہیں ہے، ہم اپنا وطن چھوڑ کر وہاں کیوں جائیں؟"

حیرت سے بجناچاریہ نے کہا،

"پاکستان تمھارا وطن نہیں ہے؟"

"نہیں!"

"پھر اس کے لیے یہ پاپڑ کیوں بیلے؟ یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں؟ دُنیا کے بُرے کیوں بنے؟"

بے پروائی کے ساتھ امتیاز نے کہا،

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہم نے ترکوں کے لیے بھی یہ سب کچھ کیا تھا، پھر کیا ہمیں قسطنطنیہ چلا جانا چاہیئے تھا؟ ہم نے مصر کے لیے، ایران کے لیے، افغانستان کے لیے بھی، یہ سب کچھ کیا تھا، گولیاں کھائی تھیں، جیل گئے تھے، لاٹھیاں سر پہ روکی تھیں، لیکن کبھی ہمارے دل میں خیال نہیں آیا کہ قاہرہ کو، یا طہران کو، یا کابل کو اپنا وطن بنالیں، ہم یہیں کے تھے یہیں ہے، بالکل اسی طرح ہم نے پاکستان کے لیے کام کیا، جیل گئے، لاٹھیاں کھائیں تکلیفیں سہیں، لیکن ہم یہیں کے تھے، یہیں رہیں گے، ہم حق کے ساتھی ہیں پاکستان کا مطالبہ برحق تھا، ہم نے اس کا ساتھ دیا، کل اگر پاکستان ناحق پہ چلے تو ہم اس کی مخالفت کریں گے، لڑیں گے اس سے!"

بجناچاریہ نے دانتوں تلے انگلی دبائی حیرت کے ساتھ امتیاز کو دیکھتا ہُوا بولا،

کے برابر!"

"یہ تو میں کہتا ہوں آج کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"تم نہیں جانتے، سیاست بدلتی رہتی ہے، اور سیاست کے ساتھ حالات میں بھی، انقلاب ہوتا رہتا ہے، اس ملک میں اب وہ دور آ رہا ہے کہ مذہب کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کی تشکیل ختم ہو جانی چاہیئے ہیں نہیں پاکستان میں بھی یہی ہونا چاہیئے۔"

"یہ کیوں؟"

"دونوں ملکوں میں حالات و مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ مشترک سیاسی جماعتیں بنیں، جن میں ہندو اور مسلمان دوش بدوش کام کریں، اقلیت اور اکثریت ایک دوسرے کو پہچانیں۔"

"تو اب تک جو کچھ ہوا وہ غلط ہوا!"

"بالکل نہیں ——— اب تک جو کچھ ہوا، وہ ٹھیک ہوا لیکن اب آئندہ سے راہ عمل بدل جانی چاہیئے!"

"اس لیے کہ اقلیت کی پٹائی ہو رہی ہے؟"

"اس لئے کہ اب اکثریت اور اقلیت کا سوال ہے، دو جداگانہ قوموں کا نہیں، قومیں آپس میں لڑ سکتی ہیں، اقلیت اور اکثریت کا تصادم ہلاکت خیز ہوتا ہے!"

"یہ کیا آپ کہہ گئے، میں نہیں سمجھا!"

امتیاز نے مسکراتے ہوئے کہا،

"او مائی گاڈ، آپ پاکستان کی مخالفت کریں گے؟ ذاتی
اُس سے؟"

امتیاز نے استقلال کے ساتھ جواب دیا،

"ہاں ضرور، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ پاکستان کا فرض
کہ وہ اپنے تئیں ہماری ہمدردی اور محبت کا اہل ثابت کرے، اب
پاکستان سے وہی تعلق ہے جو ایران سے ہے، افغانستان سے
مصر سے ہے ترکی سے ہے!"

بھٹاچاریہ مسکرا دیا،

"واہ رے آپ! لیکن آپ کے گھر والے تو جائیں گے پاکستان
آپ ہی کہہ رہے تھے!"

امتیاز مسکرا دیا،

"ہاں! جانے دو انھیں، وہ اپنے فعل کے مختار ہیں، میں اپنے فعل
مختار ہوں، میں ان کی تقلید کیوں کروں؟"

"جی نہیں گھبرائے گا، خاندان سے الگ رہ کر؟"

"بالکل نہیں، میرا خاندان آج سے نہیں صدیوں سے جہاں رہتا
میں تو وہیں رہوں گا، وہی میرا وطن ہے!"

"ڈھلکے اب کانگرس کی طرف!"

"مگر ایسا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، مسلم لیگ کا مقصد
ہو گیا، اب ہندوستان میں اس کی ضرورت اگر ہے تو بہت کم

امتیاز عجیب اضطراب بنا ہوا محمود کو دیکھ رہا تھا،

امتیاز نے پوچھا،

"محمود تم بڑے ہنس مکھ تھے، آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

بولا،

"میں نے جو کچھ دیکھا ہے ——— میں نے جو کچھ دیکھا ہے ——— تعجب ہے میں پاگل کیوں نہیں ہو گیا؟ میرے دماغ کی رگیں کیوں نہیں پھٹ گئیں؟ میرے دل کی حرکت کیوں نہیں بند ہو گئی؟ ———

اور یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، امتیاز اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا، اس کا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا،

"محمود، یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم نے کیا دیکھا، مجھے بھی تو بتاؤ!"

"کیا کرو گے سن کر، امتیاز ——— لیکن نہیں، میں سناؤں گا، میں سناؤں گا، میں بتاؤں گا، میری بھی بہنیں ہیں، وہ بھی خوبصورت ہیں۔ وہ بھی تعلیم یافتہ ہیں، دامن مریم کی طرح ان کا دامن بھی پاک ہے، میں انھیں رسوا نہیں ہونے دوں گا، میں ان کی بے آبروئی نہیں دیکھ سکوں گا، میں انھیں غیر مسلم گنواروں، اور بدمعاشوں کے ہاتھوں نہیں گرفتار ہونے دوں گا، میں بہادر ہوں، میں مسلمان ہوں، میں مرنا بھی جانتا ہوں، میں مار بھی سکتا ہوں، میں سب کو مار ڈالوں گا، اور سب سے پہلے اپنی بہنوں کا گلا گھونٹ دوں گا!" ———

"یہ ہائر پالی ٹیکس ——————— کی باتیں ہیں، تم بیچ
ناقص العقل لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں!"

بھٹاچاریہ ایک قہقہہ لگاتا ہوا چلا گیا،

کوئی دو ہفتے بعد کا واقعہ ہے، امتیاز اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ مح
آگیا، یہ بھی امتیاز کے ساتھ فوجی تربیت حاصل کر رہا تھا، اسے دیکھتے
امتیاز اُٹھ کھڑا ہُوا،

"اماں تم کب آئے محمود وطن سے؟"

وہ بولا،

"سیدھا اسٹیشن سے آرہا ہوں!"

"خیریت؟"

پھر امتیاز نے محمود کے چہرے پر نظر ڈالی، تو اسے سکتہ سا ہوگیا، و
محمود جو ہمیشہ پھول کی طرح شگفتہ رہتا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا، اس وقت
اس کا ایک ایک رواں رو رہا ہے، چہرہ پژمردہ، آنکھیں پُرنم، لباس
اُڑا اُڑا ہوا، آواز میں ارتعاش، امتیاز نے بیقرار ہوکر پوچھا،

"محمود، محمود؟"

"کہو امتیاز"

"تمھیں کیا ہوگیا ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہے ——— لیکن پوری قوم پر تباہی اور ہلاکت
چھا رہی ہو تو کسی ایک آدمی کی خیریت کا سوال بے معنی ہے!"

"ہاں، بالکل سچ، اب کہہ ڈالو، تم کیا کہہ رہے تھے؟ کس واقعہ کا ذکر کر رہے تھے؟"

محمود کے حواس کسی حد تک بجا ہو چکے تھے، اس کا جوش نبتاً ٹھنڈا پڑ چکا تھا، اس نے کہا،

"میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی، وطن سے واپس آیا ہوں، ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی رک لی گئی، اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا، کیا تمہارے لیے یہ واقعہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا؟"

امتیاز نے حیرت کے ساتھ کہا،

"مسلمانوں کا قتل عام کوئی اہمیت نہیں رکھتا، تمہاری نظر میں؟"

"بالکل نہیں، اس واقعہ میں ندرت نہیں رہی، یہ تو روز ہوتا رہتا ہے، دن میں کئی مرتبہ ہوتا ہے۔"

"خیر، اپنی داستان کہو!"

"میں سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں اپنی فوجی وردی پہنے بیٹھا تھا، سامنے کی برتھ پر دو نو عمر لیکن بے انتہا حسین و جمیل لڑکیاں عمدہ سے عمدہ کپڑے پہنے، اوڑھے بیٹھی تھیں، اور انگریزی میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں، انگریزی صاف اور رواں تھی، معلوم ہوتا تھا، کسی بڑی اچھی درسگاہ میں انھوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی ہے، امتیاز! میں سچ کہتا ہوں، ایسی خوبصورت، اور شائستہ لڑکیاں میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھیں، حالانکہ ہمیشہ اونچی سے اونچی سوسائٹیوں

اور یہ کہتے کہتے وہ دیوانہ وار امتیاز کی طرف بڑھا اور اس کا گلا گھونٹنے لگا، اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے، اس پہ جنون کی کیفیت طاری تھی، اس کی آنکھیں خون کبوترکی طرح سرخ ہو رہی تھیں، امتیاز نے پوری طاقت سے محمود کو پکڑا، قابو میں لا کر زبردستی آرام کرسی پہ بٹھا دیا، اور سے جکڑے ہوئے بیٹھا رہا، صاف معلوم ہو رہا تھا، محمود اس وقت ہوش کھو چکا تھا، وہ امتیاز کے سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا، لیکن، امتیاز کرتی نوجوان تھا، محمود پر جوش، لیکن دبلا پتلا منحنی، امتیاز نے بڑے پیار سے محمود کی پیٹھ تھپکی، اور کہا،

"محمود، انسان بنو، تم تو بڑے اچھے آدمی تھے، وفعتہً بدل کیوں گئے؟"

محمود کے منہ سے بے ساختہ صدا بلند ہوئی،

"آہ امتیاز!"

اور وہ بچوں کی طرح بلبلا کر رونے لگا،

امتیاز نے کہا

"تم مسلمان ہو، اور مسلمان روتے نہیں، وقت پہ جان دے دیتے ہیں؟ ———— مجھ سے کیوں نہیں کہتے، کیا دیکھ آئے ہو؟ میں تمھارا ساتھ دوں گا، تمھارے ساتھ مروں گا!"

محمود حیرت کے ساتھ بولا،

"سچ امتیاز؟"

کر کے بولے،

"یہ کون ہیں ؟"

نوجوان نے کہا،

"یہ تو عورتیں ہیں؟"

بلوائیوں کے لیڈر نے کہا،

"انہی کی تو ہمیں ضرورت ہے! —————— تمھارا نام کیا ہے؟"

نوجوان نے کہا،

"اوم پرکاش!"

بلوائیوں نے ان دونوں لڑکیوں کو پکڑ لیا، اور زبردستی نیچے اُتارا —————— آہ! انھوں نے جس بے بسی کی نظر سے اس نوجوان کو دیکھا، اس کی تصویر میں الفاظ میں نہیں کھینچ سکتا، میری طرف وہ کیا دیکھتیں مجھے تو وہ ہندو سمجھ رہی تھیں، اور خدا کی قسم اگر میں نہتا نہ ہوتا تو ان پر اپنی جان قربان کر دیتا ——————"

امتیاز نے کہا،

"پھر کیا ہوا؟"

محمود نے بتایا،

"وہ لڑکیوں کو اتار لے گئے، نوجوان نے لڑکیوں کی طرف نہیں دیکھا بلوائیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا، نیچے پٹڑی کے پاس مسلمان دھڑا دھڑ قتل کیے جا رہے تھے، بلوائیوں نے سب کو قتل کر دیا، لیکن ان

میں میرا اٹھنا بیٹھنا رہتا ہے،

امتیاز نے پھر ٹوکا،

"بہکو نہیں، بات پوری کرو!"

محمود نے کہا،

"پاس ہی دوسری برتھ پر ایک خوش پوشاک اور خوش اندام نوجوان انگریزی لباس میں ملبوس بیٹھا تھا، وہ بھی اتنی ہی اچھی انگریزی میں ان لڑکیوں سے ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا!"

محمود کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا،

"ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر، ایک بہت بڑے مجمع نے گاڑی روک لی، اور مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں، عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نیچے اتار اتار کر قتل کرنے لگے، رونے کی، چیخنے کی، فریاد کرنے کی فلک شگاف، آوازیں آ رہی تھیں، میں چپ چاپ بیٹھا تھا، اتنے میں کچھ بلوائی ہمارے کمپارٹمنٹ میں آئے، بالکل اجڈ گنوار، جاہل، بد اندیش، ایک نے پوچھا،

"یہاں کوئی مسلمان ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نوجوان نے کہا،

"نہیں!"

اب وہ بلوائی اوپر چڑھ آئے، اور ان لڑکیوں کی طرف اشارہ

"تم انھیں نہیں لے جا سکتے!"

وہ بولے،

"کیوں؟"

نوجوان نے کہا،

"یہ میری بہنیں ہیں!"

"تو کیا کریں؟ ——— تم مسلمان ہو؟"

"ہاں! میں مسلمان ہوں، انھیں تم صرف اس طرح لے جا سکتے ہو کہ مجھے قتل کر دو۔"

وہ بولے،

"تو یہ کون سا مشکل کام ہے الو!"

دفعتہً ایک خنجر چمکا، اور نوجوان کے سینے میں پار ہو گیا، وہ تڑپ کر گرا، اور ہلاک ہو گیا، خنجر اس کے سینہ میں پیوست تھا کہ ایک لڑکی نے بجلی کی سی تیزی سے وہ خنجر نکال کر پہلے اپنی بہن کو جو الگ کھڑی تھی زخمی کیا، اور پھر وہ خنجر اپنے سینہ میں بھونک کر، بھائی اور بہن کے پہلو بہ پہلو خاک و خون میں تڑپنے لگی، اور وہ بلوائی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ دنیا میں ایسے بے وقوف بھی ہوتے ہیں، جو اس طرح خود اپنی جان دے دیتے ہیں!"

یہ کہانی سن کر، امتیاز بہت متاثر ہوا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، محمود اٹھ کر اس کے قریب آیا، اور بڑے محبت بھرے لہجہ

لڑکیوں کو نہیں قتل کیا، گھسیٹتے ہوئے سے چلے، جیسے قصائی، بکری کو کھینچ کرے جاتا ہے، جب یہ منظر اس نوجوان نے دیکھا، تو عجیب کرا اور عجیب بے تابی کے عالم میں کہا،

"یہ تو بیٹھ جا رہے ہیں!"

مَیں نے کہا،

"تو آپ کا خیال کیا تھا؟"

"میں سمجھا تھا قتل کر دیں گے!"

مَیں نے کہا،

"یہ تو اور اچھا ہوا، کہ ان کی جان بچ گئی، قتل نہیں کی گئیں!"

وہ بے تاب ہو کر بولا،

"نہیں، یہ بہت بُرا ہوا، وہ میری بہنیں ہیں، مَیں ان کا بھائی ہوں، میں ان کا قتل ہونا گوارا کر سکتا تھا، لیکن بدمعاشوں کے پنجہ میں اسیر اور بے آبرو نہیں دیکھ سکتا، میں انھیں بچاؤں گا، ورنہ اپنی جان دے دوں گا!"

اور یہ کہہ کر وہ گاڑی سے پھاندا، میں کھڑکی سے سر باہر نکالے ہوئے سارا تماشہ دیکھ رہا تھا، وہ ان لوگوں کے پاس پہنچا، جن کے قبضہ میں وہ لڑکیاں تھیں، اس نے کہا،

"ٹھیرو!"

وہ ٹھہر گئے، وہ نوجوان بولا،

باب ۷

امتیاز بھی ——

دلّی کے ابتر حالات کی اطلاع امتیاز کو خطوط سے برابر ملتی رہتی تھی، اخبارات سے بھی اندازہ ہوتا رہتا تھا، اتنی اتنی گھنٹے کا کرفیو بھی عام ہو گیا تھا، کبھی کبھی مختصر پیمانے پر کشت و خون بھی ہو جاتا تھا، لیکن کوئی حادثہ اب تک رونما نہیں ہوا تھا، اور ایک روز امتیاز اور محمود پاس پاس بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، کہ ریڈیو نے خبریں سنانی شروع کیں، دلّی کا انونسر بول رہا تھا، آج دلّی میں دو فرقوں کے مابین، فساد پھوٹ پڑا، فوج طلب کر لی گئی، کچھ لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے، لیکن شام تک حالات پر قابو پا لیا گیا،

امتیاز نے کہا،

"معلوم ہوتا ہے، زبردست فساد ہوا ہے، دلّی میں، ورنہ فوج

میں گویا ہُوا،

"یہاں اب گزر نہیں ہو سکتا، ہمیں پاکستان جلد چلنا چاہیے!"

امتیاز نے کہا،

"ٹھیک کہتے ہو ——— تمہارے کاغذات ابھی تک نہیں آئے، غالباً ابھی دو چار دن لگیں گے!"

محمود نے پوچھا،

"اور تمہارے کاغذات؟ وہ آ گئے؟"

"نہیں! ——— میجر اچاریہ کہہ رہے تھے، شاید کچھ زیادہ دن لگ جائیں گے!"

"میں نے سُنا ہے، دلی کے حالات بھی بہت ابتر ہوتے جا رہے ہیں!"

"اطلاعات تو ایسی ہی آ رہی ہیں، خدا خیر کرے!"

پر پرواز پیدا کرے، اور دِلّی اُڑ جائے، لیکن راستہ خطرناک تھا، اس کے دوست کسی قیمت پر بھی اسے دِلّی جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے، میجر اچاریہ کی سخت تاکید تھی، کہ امتیاز کا خاص خیال رکھا جائے اور اس کا دِل بہلانے کی کوشش کی جائے، لیکن ان تمام خلوص نوازیوں کے باوجود، امتیاز کا دل ٹھہرنے کا نام نہیں لیتا تھا، وہ دھڑک رہا تھا، وہ سوچتا تھا، دُنیا کا کیا حال ہوگا؟ بھابی کس حال میں ہوگی؟ حاجی صاحب کس طرح زندگی بسر کر رہے ہوں گے؟ اور سب سے بڑھ کر، سلطانہ پر کیا گزر رہی ہوگی؟ یہ سب باتیں سوچ کر، اس پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے؟ کس طرح دِلّی پہنچے؟ اور سب کو بخیریت دیکھ کر واپس آجائے؟

شنکر امتیاز کی ذہنی اور دماغی اُلجھنوں اور پریشانیوں کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا، اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی بے فکری، اور مسرت اسے دے دیتا، اور خود اس کی پریشانی اور غم مول لے لیتا، لیکن وہ جانتا تھا ــــــــ بارِ غم دنیا میں اٹھواتے نہیں مزدور سے!

شنکر نے سوچا، شاید منصوری امتیاز کے زخم کا مرہم بن سکے، وہاں کے خوب صورت، اور دلکش مناظر، وہاں کا حسن رہ گذر، وہاں کی سوسائٹی، وہاں کی تفریحات، اور دلچسپیاں، شاید اس کا دامن دل اپنی طرف کھینچ سکیں، لیکن یہ نادان شنکر نہیں جانتا تھا، کہ امتیاز کا غم

طلب کرنے کے کیا معنی؟ مجھے تو اختلاج ہو رہا ہے!"
محمود نے کہا،
"واہی ہوئے ہو؟ اختلاج کی کیا بات ہے؟ اگر شدید فساد ہو
تو بھی فوج نے اس پر قابو پالیا!"

امتیاز نے فوراً ایک تار حاجی عبدالستار اور پروفیسر نیاز کو طل
خیریت کا بھیجا، دن بھر بیتابی سے انتظار کرتا رہا، مگر صدائے برنخا
تیسرے دن دلّی کے اخبارات ملے، ہندوستان ٹائمز نے کافی رنگ
کی تھی، لیکن وسٹیٹسمین نے امور خانہ غیر جانبداری کے ساتھ اب کا
سارے حالات لکھ دیئے تھے، پھر تو مختلف ذرائع سے اطلاعات
لگیں، اور حالات معلوم ہونے لگے، خود دلّی سے اس کے بعض
ساتھی آئے، اور انھوں نے آنکھوں دیکھا حال رو رو کر بیان کیا
ہونے کے باوجود، وہ مسلمانوں کے کم از کم اپنے ہم شہر اور ہم محلہ مسل
کے دشمن نہیں تھے، انہی سے امتیاز کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان
برباد ہو کر جامع مسجد کے وسیع دامن میں پناہ گزیں ہیں، پھر اسے
معلوم ہو گیا کہ سبزی منڈی، پہاڑ گنج، اور قرول باغ سے مسلمانو
تمام و کمال استیصال ہو گیا، اس خبرِ وحشت اثر نے اس کے ہو
حواس معطل کر دیئے، وہ بار بار بیتاب ہو ہو کر، تار دیتا تھا خط
لیکن جواب سے محروم رہتا تھا، اب اسے معلوم ہوا کہ جواب کیو
ملا؟ نہ تار منزلِ مقصود پر پہنچے ہوں گے، نہ خط، اب وہ چاہتا تھا

مجھے ہزار درجہ مرغوب و محبوب ہے!"

شنکر جانتا تھا یہ ساری بے کلی اور بیقراری، سلطانہ کے لیے ہے، وہ خود بھی کئی مرتبہ مختلف لڑکیوں سے والہانہ شدّت کے ساتھ عشق کر چکا تھا، جانتا تھا، عشق میں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اس نے کہا،

"نہیں مانتے، تو جاؤ!"

"شکریہ، کل ہم روانہ ہو جائیں گے!"

"لیکن ایک شرط ہے؟"

"نہیں شنکر، اب شرط ورط کا نام نہ لو، میرے راستہ کا پتھر بننے کی کوشش نہ کرو!"

شنکر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا،

"میں راہبر بننا چاہتا ہوں تمھارا!"

"یعنی؟"

"میں تمھارے ساتھ چلوں گا!"

"میرے باڈی گارڈ بن کر؟"

"ہاں یہی سمجھ لو!"

"اگر تمھیں موت اتنی ہی عزیز ہے تو میں روک نہیں سکتا، بسم اللہ چلو!"

"شکریہ!"

ایسا نہیں تھا جو اس طرح دُور ہو جاتا لیکن وہ ضدی تھا، اور کھینچ تان امتیاز کو منصوری لے گیا۔

منصوری، ہندوستان کے بہترین، اور خوب صورت ترین پہاڑوں میں سے ہے۔ "دردِ دل" کا قدرتی علاج" جتنا اچھا وہاں ہوتا ہے اور جگہ مشکل سے ہو سکتا ہے، لیکن امتیاز کا درد یہاں آ کر اور بڑھ گیا۔ سلطانہ کی یاد بے طرح اسے ستا رہی تھی، وہ دل کو بار بار اطمینان دلاسا دیتا تھا، کہ سلطانہ خیریت سے ہوگی، آرام سے ہوگی، لیکن اس فریب امیّد کا پردہ چاک کر دیتا تھا، طرح طرح کے بھیانک تصور اس کے سامنے آتے تھے، اور وہ کانپنے لگتا تھا، آخر اس نے ایک دن تنگ آ کر کہا،

"شنکر میں یہاں نہیں رہ سکتا"

شنکر نے کہا،

"کیوں؟ وجہ؟"

"میرا جی گھبراتا ہے، میں دِلّی جاؤں گا!"

"دِلّی جاؤ گے؟"

"ہاں، وہیں!"

"لیکن راستہ خطرناک ہے!"

"ہونے دو، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ مار ڈالا جاؤں گا؟ لیکن موت سے نہیں ڈرتا، اس زندگی سے جو میں گزار رہا ہوں، مو

شنکر چلا گیا، اور امتیاز بدستور سیوائے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا رہا
شنکر کے جانے کے بعد، وہ کھڑکی میں آکر کھڑا ہو گیا، اور خاموشی سے،
خاموش مناظر دیکھنے لگا، ایک طرف سر بہ فلک چوٹیاں تھیں جن تک
رسائی ناممکن تھی، اور ایک طرف بڑے بڑے غار تھے، جو اپنا خوفناک
جبڑا کھولے ہوئے آئندہ و روند کو دعوت ہلاکت دے رہے تھے، امتیاز
سوچنے لگا، یہ ہلاکت کیا چیز ہے؟ یہ موت کیا ہے؟ زندگی کیوں ہے؟
یہ سارا طلسم ہست و بود، کس ستم ظریف کا شاہکار ہے؟ یہ
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

بڑی دیر تک کھڑکی میں کھڑا ہوا، وہ اسی رمز قدرت پر غور کرتا رہا
لیکن یہ گرہ کسی سے بھی آج تک کھلی ہے جو امتیاز اسے کھول لیتا؟
آخر تنگ آکر، وہ اپنے کمرہ سے باہر نکلا، کچھ دیر ادھر ادھر گھوما پھر
ہوٹل سے باہر نکلا، اور جس طرف منہ اٹھ گیا، چل پڑا، اس کے سامنے کوئی
منزل نہیں تھی، بغیر تعین منزل کے وہ بڑھا چلا جا رہا تھا، تنہا،
اکیلا! ——————

خاموش، اور پُرسکون! ——————
لیکن منزل اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی! ——————
اس کا دامن پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہی تھی ——————
اور وہ منزل کے تعاقب سے بے خبر، اور بے پروا، رواں دواں

تھوڑی دیر تک دونوں دوست خاموش بیٹھے رہے، شنکر
محسوس کر لیا تھا، امتیاز اب کسی کے روکے نہیں رُک سکتا، بہتر
ہے کہ اسے جانے دیا جائے، لیکن تنہا نہیں، اس کا باڈی گارڈ بن
میں خود اس کے ساتھ جاؤں گا، یہ طے ہو چکا تھا کہ کل منصوری
روانہ ہو جائیں گے، ڈیرہ دون، اور ڈیرہ دون سے دِلّی، شنکر
سوچا کام زیادہ اور وقت کم ہو گا، ممکن ہے موقع ملے، یا نہ ملے، کیو
آج جی بھر کے مِس روبی سے ملاقات کر لی جائے، ہوٹل، سینما، سیر
سارے مرحلے آج اور ابھی طے کر لیے جائیں، یہ سوچ کر اس نے

"چلتے ہو؟"

"کہاں کا ارادہ ہے؟"

"روبی کے ہاں!"

"میں نہیں چل سکوں گا اس وقت! تم جا سکتے ہو!"

"تو اجازت ہے؟"

"بڑے شوق سے!"

"جتنی دیر کے لیے چاہوں؟"

"ہاں، جتنی دیر کے لیے چاہو، چاہو تو رات بھر وہیں رہو، صبح
مجھے کوئی اعتراض نہیں!"

"اس فیاضانہ پیش کش کا شکریہ، لیکن میں اس سے فائدہ
اُٹھا سکوں گا، ممکن ہے مجھے آنے میں دیر ہو جائے، لیکن آؤں گا

اور وضع میں تھا کہ اگر چاہتا تو آسانی سے بھاگ سکتا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، اس کے پاؤں سو سو من کے ہو گئے ہیں، اس نے بھاگنا چاہا، لیکن نہ بھاگ سکا، اس نے سوچا میری جان اتنی قیمتی تو نہیں کہ اپنی قوم کے ساتھ مرنا بھی منظور نہ ہو، اتنے میں انھوں نے دیکھا، مسٹر حمید اللہ، افتاں و خیزاں، باحال پریشاں چلے آ رہے ہیں، یہ بیرسٹر اپنی ذات کی طرف سے تھے، اور رئیس اپنے خاندان کی طرف سے بڑے شستہ اور شائستہ آدمی تھے، سوسائٹی، اور کلب، ڈانس اور میوزک، لیکچر، اور مشاعرہ کی دُنیا اسی ایک ذات واحد سے عبارت تھی، مسٹر حمید اللہ خود تو صفات گوناگوں کا مجموعہ تھے ہی، لیکن ان کی لڑکیاں بھی قیامت تھیں، زہرہ جبیں، حور پیکر، پری وش، رونق بزم اور شمع محفل! مسٹر حمید اللہ جب امتیاز کے قریب پہنچے، اس نے کہا،

"ارے آپ؟"

"ہاں بھئی میں ہوں ——— لیکن تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، خُدا کے لیے بھاگو، وہ آ رہے ہیں!"

امتیاز ان کے ساتھ ساتھ چل پڑا،

اس نے پوچھا،

"اور آپ کی صاحبزادیاں؟"

وہ درد بھری آواز میں گویا ہوئے،

"اسی شرط پر زندہ چھوڑا گیا ہوں کہ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں

گرم سیر تھا، کبھی یہاں کبھی وہاں، کبھی اِدھر کبھی اُدھر، کبھی اس گلی م
کبھی اس کوچہ میں!

لیکن یہ کیا ہوا؟

اس نے چونک کر دیکھا، اور

اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا!

آوازیں، خوفناک آوازیں، نعرے، خوفناک نعرے، آگ
دھواں، لاٹھیاں، کرپانیں، تلواریں، بم!

کیا یہاں بھی فساد ہو گیا؟ کیا اس حسین اور گل پوش کوہسار
بھی خون کی ندیاں بہیں گی، اور خون کے آبشار گریں گے؟ یہاں
انسان، انسان کا گلا کاٹے گا؟ یہاں بھی آبرو لٹے گی، اور بچے ذبح
جائیں گے؟ یہاں بھی، درندے شرم سے سر جھکالیں گے؟ اور یہ مہذ
انسان متمدن شہر میں جنگل کا راج قائم کرے گا؟ آخر کیا ہوگا؟ کیا ہو
والا ہے؟

امتیاز یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ اس نے دیکھا، ایک گروہ
جو اپنے بال بچوں کا ہاتھ پکڑے، اور تھوڑا بہت سامان لیے اِدھر
بھاگ رہا ہے، اور ایک دوسرا بہت بڑا گروہ اس کا تعاقب کر رہا
ڈنڈے چل رہے ہیں، تلواریں چمک رہی ہیں، بم پھٹ رہے ہیں
آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، پھر جو اس نے اِدھر ا
نظر دوڑائی تو ہر طرف اور ہر جگہ یہی سماں نظر آیا، امتیاز ایسے لبا

"کیا خودکشی کا ارادہ ہے؟ اب کہیں نہ جاؤ، آؤ میرے ساتھ!"

بیرسٹر صاحب نے منہ پھیر کر دیکھا تو امتیاز تیز قدم اُٹھاتا ہوا، پھر واپس جا رہا تھا، وہ سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا، لیکن یہاں کسی کو بات کرنے کی فرصت نہیں تھی، کسی نہ کسی طرح وہ انسپکٹر سے ملا، اس نے کہا،

"شہر میں ہولناک فساد پھوٹ پڑا ہے،"

انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا،

"مجھے معلوم ہے!"

امتیاز بولا،

"مسلمان بری طرح قتل ہو رہے ہیں، اور لوٹے جا رہے ہیں!"

وہ پھر مسکرایا،

"میں یہ بھی جانتا ہوں!"

وہ بھڑک کر بولا،

"آپ سب کچھ جانتے ہیں، پھر یہاں بیٹھے کیوں ہیں؟ اٹھیئے کمر ہمت باندھیئے، مظلوموں کو بچائیے!"

انسپکٹر نے ایک قہقہہ لگایا اور امتیاز کا فقرہ دوہرایا،

"مظلوموں کو بچائیے ——— آپ تو مہاتما جی سے بھی دو قدم آگے نظر آتے ہیں، ——— ہاں آپ کا نام؟"

امتیاز نے کہا،

"نام پوچھ کر کیا کیجیئے گا، اتنا کافی ہے کہ میں مسلمان ہوں!"

کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جاؤں ؟"
امتیاز نے حیرت کے ساتھ پوچھا،
"تو وہ وہیں رہ گئیں ؟"
حمید اللہ رو پڑے،
"کیوں بار بار زخم کو چرکا لگاتے ہو؟ کہہ تو دیا ہاں !"
امتیاز خاموش ہو گیا، حمید اللہ نے کہا،
"اب یہاں کوئی مسلمان نہیں بچے گا، بچ ہی نہیں سکتا!"
امتیاز نے ان کی رائے پر صاد کیا،
"آپ کا خیال ٹھیک ہے!"
دونوں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے تھے لیکن جدھر سے گزرتے تھے، ایک ہی منظر دیکھتے تھے، یہ مسلمان تھے، لیکن ان کا لباس مسلمان نہیں تھا، اسی لیے اب تک یہ بچے ہوئے تھے، ورنہ کب کے راہئ ملک عدم ہو چکے ہوتے، پھر بھی ڈر ڈر کر، اور پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے
—— کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے!
سیوا سدن ہوٹل کے دروازے پر پہنچکر، امتیاز نے کہا،
"آپ تشریف لے جائیے، میں جاتا ہوں!"
"جاتے ہو؟ کہاں ؟"
وہ بولا،
"ذرا موقع واردات تک ؟"

امتیاز کمرے سے باہر چلا آیا، اب کہاں جائے؟ باہر جاکر یہ سوچنے لگا، اور وہ اسی طرف چلا گیا، جہاں مسٹر حمید اللہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی،

فساد کی اطلاع ملتے ہی، شنکر مس روبی سے رخصت ہو کر سیدھا ہوٹل پہنچا، یہاں امتیاز کا کہیں پتہ نہ تھا، منیجر سے پوچھا، اس نے کہا، مجھے نہیں معلوم، بوائے سے دریافت کیا، کاندھے اچکا کر اس نے انکار میں گردن ہلا دی، اب وہ کہاں جائے؟ کہاں ڈھونڈھے؟ اسی فکر میں کھڑا ہوا تھا کہ مسٹر حمید اللہ سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی، اور ان سے سارا ماجرا معلوم کر کے وہ فوراً پولیس اسٹیشن پہنچا، کہ مدد کے لیے دو ایک سپاہیوں کو لے کر امتیاز کی تلاش میں نکلے،

یہاں وہی انسپکٹر صاحب تشریف رکھتے تھے، جن سے ابھی مل کر امتیاز گیا تھا، انھوں نے شنکر کو دیکھا، اور کہا،

"فرمائیے!"

شنکر نے جواب دیا،

"میں اپنے ایک مسلمان دوست کو ڈھونڈھنے نکلا ہوں آپ کی مدد درکار ہے!"

انسپکٹر صاحب نے پوچھا،

"اور خود آپ کیا ہیں؟ مسلمان کہ ہندو؟"

"میں ایک انسان ہوں ——— نام ضرور ہندوانہ ہے!"

انسپکٹر صاحب نے زہرخند کرتے ہوئے کہا،

"اوہ، جب ہی ——— آپ جا سکتے ہیں!"

"مرنے کے لیے؟"

"چہ چہ، یہ کیسا لفظ آپ نے نکالا، مرتے تو ہم لوگ ہیں، آپ تو شہید ہونے تشریف لے جائیے، افسوس غازی بننے کا کوئی چانس نہیں نظر آتا، مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے!"

کمرے میں جتنے کانسٹیبل اور سپاہی تھے، اس چست فقرے پر پھڑک گئے، اور بے تحاشہ ہنسنے لگے، ایک کانسٹبل امتیاز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا، امتیاز نے نگاہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اس نے کہا،

"یہی ایک کرسی ہے، اور صاحب سے ابھی کئی لوگوں کو ملنا ہے!"

امتیاز بگڑ گیا،

"تم میری توہین کر رہے ہو، تم نہیں جانتے، میں انڈین آرمی کا ایک فرد ہوں!"

سپاہی نے مسکراتے ہوئے کہا،

"ابھی تک مارشل لا نافذ نہیں ہُوا، پھر آپ نے کیوں تکلیف کی کمانڈر انچیف صاحب؟"

سب سے پہلے انسپکٹر صاحب نے قہقہہ لگایا، پھر سپاہیوں نے، انسپکٹر صاحب نے، امتیاز کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، اور کہا،

"اچھا، پھر ملاقات ہوگی، اگر آپ زندہ رہے!"

آپ کی برادری کے ایک صاحب ابھی ابھی تشریف لے گئے ہیں، وہ بھی اسی نیک کام کے لیے تشریف لائے تھے، لیکن کدھر گئے ہیں، یہ میں نہیں جانتا، ہمت ہو تو جائیے، ڈھونڈ نکالیے، اپنے دوست کو!"

شنکر نے پوچھا،

"وہ صاحب مسلمان تھے؟"

انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا،

"جی ہاں ـــــــ انسان نہیں، مسلمان، معلوم ہوتا ہے آپ اُن سے زیادہ ذہین ہیں!"

شنکر سمجھ گیا، یہ امتیاز کا ذکر ہو رہا ہے، وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا،

"اچھا میں اجازت چاہتا ہوں!"

اور یہ کہہ کر وہ تیر کی طرح پولیس چوکی سے نکلا چلا گیا،

شنکر نے ایک ایک گلی، اور ایک ایک کوچہ چھان مارا، لیکن اس کا یوسف گم گشتہ ـــــــ امتیاز ـــــــ کہیں نہ ملا،

اور جب وہ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا تو شام کے ہلکے اندھیرے میں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا، اس نے جھک کر دیکھا، تو ایک لاش پڑی ہوئی تھی، جذبۂ اشتیاق میں اور قریب سے دیکھا، تو آہ کر کے وہیں تیورا کر گر پڑا ـــــــ یہ امتیاز کی لاش تھی!

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
مارا دیارِ غیر میں مجھکو وطن سے دور!

انسپکٹر صاحب نے فرمایا،

"اگر آپ ہندو ہیں، اور ایک مسلمان دوست کی تلاش میری مدد سے
کرنا چاہتے ہیں، تو آپ غلط جگہ آئے ہیں!"

"یعنی، کیا مطلب آپ کا؟"

ذرا زور سے انسپکٹر صاحب نے کہا،

"میرا مطلب یہ ہے کہ پھر آپ کو پولیس اسٹیشن آنے کے بجائے
پاگل خانے جانا چاہیئے تھا!"

حاضرین پھر زور زور سے ہنسنے لگے، شنکر کو غصہ تو بہت آیا، لیکن
اس نے ضبط سے کام لیا، اور بڑی سنجیدگی سے کہا،

"اس سے اچھا پاگل خانہ کوئی اور مشکل سے ملے گا، جہاں اس وقت
میں غلطی سے آکر بیٹھا ہوا نظر آرہا ہوں!"

انسپکٹر صاحب کو اتنی بے تکلفانہ حاضر جوابی کی توقع نہ تھی
جھلا گئے، انھوں نے فرمایا،

"خاموش!"

شنکر نے کہا،

"آپ کو معلوم ہونا چاہیئے، میں انڈین آرمی کا ایک فرد ہوں!"

انسپکٹر کو ہنسی آگئی،

"اوہو، بہت خوب، بہت خوب، معلوم ہوتا ہے، ساری
آرمی مسلمانوں کو بچانے کے لیے منصوری ہی میں ڈیرے ڈالے پڑی

اور لیٹ بھی گئے، لیکن گاڑی یہی ایک تھی، اور ابھی بہت سے لوگوں کو جانا تھا، اور یہ لوگ اب یہاں ایک منٹ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے، نہ چاہتے تھے، اگر مرنا ہے تو یہاں کیوں مریں؟ پاکستان میں کیوں نہ مریں؟ جس طرح عزت کی زندگی لوگ پسند کرتے ہیں، اسی طرح عزت کی موت بھی لوگوں کی من بھاتی چیز ہے۔

جو لوگ ریل کے اندر پہنچ چکے تھے، انھوں نے اچھی اچھی جگہوں پر قبضہ کرنے کے بعد، دروازے اندر سے بند کر لیئے، اور سٹکنی لگالی پھر مزید احتیاط کے طور پر بڑے بڑے بکس، اور صندوق اڑا دیئے، لیکن ہوا کی ہر حال ضرورت تھی، کھڑکیاں کھلی رکھیں، اور ہوا کھانے لگے، ضرورت ایجاد کی ماں ہے، لوگوں نے کھڑکیاں کھلی دیکھیں تو اسی طرف سے ٹوٹ پڑے، اندر والے ہاں ہاں کرتے رہے، اور باہر والے چھلانگیں لگاتے رہے، سب کے پاس ٹکٹ تھے، ریل پر جتنا حق اندر والوں کا تھا، اتنا ہی باہر والوں کا تھا، کوئی کسی کو کسی حق سے روک سکتا تھا؛ کھڑکیوں سے ریل کے اندر جو ریل پیل شروع ہوئی، تو تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی، دم گھٹنے لگا، جی اُبلنے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں تو تو مَیں مَیں شروع ہوگئی، آخر وقت تو کسی طرح کٹے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق!

حاجی ستار نے کسی طرح گر پڑ کے زنانہ ڈبہ میں، رخسانہ، ریحانہ اور نسرین بیگم کو سوار کرا دیا تھا، اس مرحلہ پر بھی بڑا معرکہ پیش آیا،

باب ۸

اسپیشل ٹرین

نظام الدین کے چھوٹے سے اسٹیشن پر، ایک انبوہ کثیر ٹوٹا پڑ رہا
یک انار و صد بیمار کی اس سے بہتر مثال مشکل سے ملی ہوگی، جت
ڈبے تھے، اور اژدہام کا یہ عالم تھا کہ اسٹیشن کے باہر تک لوگ کھڑ
تھے کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اسی مجمع ناپرساں میں، حاجی صدر
نیاز کو سہارا دیئے، مضمحل اور افسردہ کھڑے تھے، ان کے پیچھے ن
بیگم اور ان کے بازو میں رخسانہ اور ریحانہ، سب کے بڑھتے ریلے پ
ہو رہے تھے، اندر سے کپڑوں کا بھی یہی حال تھا، جو توانا اور طاقتو
وہ کمزوروں کو پیچھے چھوڑ کر، بلکہ دھکا دے کر، اور پیچھے ہٹا کر، آ
بڑھے اور ریل میں اپنی جگہ بنالی، سامان بھی رکھ لیا، بستر بھی بچھا

مضبوط پکڑ لیا، اب اسپیشل کے چھوٹنے میں تھوڑی سی دیر رہ گئی تھی، اور حاجی صاحب سوچ رہے تھے، اب کیا ہوگا؟ کیا عورتوں کو جا کر اتار لاؤں؟ یہ سوچ کر انھوں نے زنانہ کمپارٹمنٹ پہ ایک نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہاں بھی لڑکیوں کے راستے، چھلانگیں لگائی جا رہی ہیں، اور اس وقت کسی نہ کسی طرح اندر جانا تو شاید ممکن بھی ہو جائے، لیکن اندر سے باہر آنا قطعاً ناممکن ہے، یہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور یہ موتی آنکھ کے صدف سے داڑھی کے دامن پر گرنے لگے، اور خود بخود ان کی زبان خاموش پہ یہ شعر آگیا،

لختِ دل پُرخونے، از دیدہ فرو می ریزم
لعل زبدخشانم بردارد بہ خانم زن

پھر انھوں نے سوچا، اس لعلِ بدخشاں کے جوہری یہاں کہاں ہیں کہ اسے نگینہ بنا کر، اپنی انگشتری کی زینت بنائیں، وہ جوہری تو پاکستان جا چکے، ان آنسوؤں کی داد وہی دے سکتے ہیں، وہی دیں گے، لیکن کسی طرح وہاں تک رسائی تو ہو، ہا، کیسی بیچارگی ہے، منزل سامنے ہے، مگر قدم نہیں اٹھ سکتا، کارواں جرس رحیل کا منتظر کھڑا ہے، مگر یہاں، اس کی گرد راہ بننے کی سکت بھی نہیں،

اور نیاز عالم تصور میں امتیاز پہ بہت خفا ہو رہا تھا، لڑکپن کی حد ہے کوئی؟ صاحبزادے اب تک دہرہ دون میں مزے اڑا رہے ہیں نہ بھائی سے مطلب، نہ منگیتر کی فکر، ساری دنیا دلی کے حال زار پہ آنسو بہا

عورتوں کی خواہش تھی کہ سب ایک ہی ڈبہ میں بیٹھیں، خود حاجی صا
بھی موجودہ مخدوش حالات کے باعث یہی چاہتے تھے کہ سب ساتھ
ڈوبیں تو ساتھ، تیریں تو ساتھ، لیکن حالات ایسے تھے کہ اس خواہ
کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں نظر آرہا تھا، تمام مردانہ ڈ
لبالب، اور کھچا کھچ بھر چکے تھے، یہی بڑا ٹیڑھا سوال تھا، کہ خود حا
صاحب اور نیاز کس طرح چھلانگ لگا کر اندر پہنچیں، اور عورتوں ک
اس طرح پہنچانا، ان لوگوں کے لیے قطعاً نا ممکن تھا ان میں
ایک بوڑھا تھا، دوسرا بیمار، کیونکر ممکن تھا کہ یہ دونوں معذور تین عو
کو گود میں لے کر اندر پہنچتے؟ یہ مجبوری دیکھ کر تن بہ تقدیر، آخر عو
بھی راضی ہونا پڑا، اور بادل نخواستہ وہ زنانہ میں گھس گئیں لیک
حیض بیض میں اتنی دیر ہو چکی تھی کہ بیٹھنے کی جگہ کسی کو نہ ملی، رخسا
ریحانہ تو خیر کھڑے کھڑے بھی یہ سفر گزار لینے پر تیار تھیں، لیکن نسر
بڑھاپے، غم، اور بیماری کی ایسی ماری ہوئی تھیں، کہ کھڑا رہنا تو بڑی
ہے، وہ بیٹھ بھی نہیں سکتی تھیں، ریحانہ اور رخسانہ نے ہم سفر
منت سماجت کر کے، دو بنچوں کے درمیانی فرش پر لستر لگا دیا، او
بیگم لیٹ گئیں، لیٹ کیا گئیں، گٹھری بن کر پڑ گئیں!

اور حاجی صاحب، غیر جانبدار تماشائی بنے، چپ چاپ کھڑے
اور نیاز؟ اب کمزوری اور نقاہت کے سبب اس کے قدم لڑکھڑانے
حاجی صاحب نے اس کا یہ حال دیکھ کر اپنے کمزور ہاتھوں سے ا

لیکن نہیں، اتنے دنوں کی ملاقات کے بعد، ڈانٹنا پھٹکارنا، مناسب نہیں ہے، میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا، یہ ضرور ہے میری آنکھیں بہنے لگیں گی، اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے، بس یہی آنسو، میری اس کی تمام غلط فہمیوں کو دھو دیں گے، مٹا دیں گے!———
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر،———
لیکن میری اس کی جنگ کہاں ہے؟ ہو بھی نہیں سکتی، وہ چھوٹا میں بڑا

اتنے میں ایک خوش وضع، اور خوبصورت نوجوان، فوجی لباس میں ملبوس، سامنے سے گزرا، ٹھٹکا، پھر آگے بڑھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا، اور سامنے آکر کھڑا ہو گیا، دفعتاً اس کے منہ سے آواز نکلی،

"نیاز بھیا!"

نیاز نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا، اور کمزور آواز میں کہا،

"شنکر!"

اور پھر جوش میں آکر بولا،

"شنکر تم دہرہ دون سے آرہے ہو؟"

نیاز کا یہ حال زار دیکھ کر شنکر کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، اس نے کہا،

"ہاں بھیا!"

رہی ہے، اور، انھیں خبر ہی نہیں، اتنے خط لکھے، اتنے تار دیے، مگر
کسی کا جواب نہیں، کسی کی رسید نہیں، یہ لونڈا، اب ایسا ہے تو آ
چل کر کیا ہوگا؟ سنبھل چکا اس سے گھر، لیکن نہیں مجھے اس پر خفا نہیں ہو
چاہیے، بگڑنا نہیں چاہیے اس سے! وہ میرا اکلوتا بھائی ہے، مرحوم باپ
اور مرحوم ماں کی آخری نشانی، اماں جان نے مرتے وقت اس کا ہاتھ
میرے ہاتھ میں دیا تھا، اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تھا، نیاز، اپنا زن
میں نے تجھے کسی قابل بنانے میں صرف کر دیا، دیکھیو، یہ امتیاز تیرا بھائی
ہے، اور بیٹا بھی، میرے امتیاز کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے، اور
میں نے اپنی پیاری ماں سے عہد کیا تھا، امتیاز کو میں دنیا میں سب سے
زیادہ عزیز رکھوں گا، اپنی جان بھی اگر ضرورت ہوئی تو اس پر قربان کر دوں
نہیں اس نے خط اور تار ضرور بھیجا ہوگا، لیکن وہ قلعہ میں مجھے کس طرح
ملتا؟ اس نے دلی آنے کی بھی کوشش کی ہوگی، لیکن پاکستان گورنمنٹ
نے کسی فوری ضرورت سے بلا لیا ہوگا، میرا بھائی بہت اچھا ہے، بڑا
پیارا، وہ مجھے بہت چاہتا ہے، وہ مجھے بھول نہیں سکتا، پاکستان میں
جب اس سے ملاقات ہوگی، اور وہ میرے گلے سے آ کر لگے گا تو
اس کی پیٹھ تھپک کر اس کی یہ ساری فراموش کاریاں معاف کر دوں
لیکن نہیں، بظاہر جھوٹا بہت ڈانٹوں گا، تاکہ اس پر رعب رہے، بڑے
کا، چھوٹوں پر بہر حال رعب رہنا چاہیے، لیکن میری ڈانٹ کا
اثر، ریحانہ، امتیاز کی بھابی جان مذاق اڑا کر غارت کر دیتی ہیں

"جیتے رہو بیٹے!"

شنکر نے کہا،

"مَیں آپ کی نشست کا انتظام کرتا ہوں!"

ایک مرتبہ وہ ساری گاڑی کا چکر لگا آیا، لیکن واقعی کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، پھر وہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا، اور اس سے کہا کہ وہ کوئی انتظام کرے، وہ بہت مصروف تھا،

اس نے کہا،

"لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ تو ممکن نہیں، کچھ لوگوں کے اندر سے اتار کر باہر کے لوگوں کو اندر پہنچا دوں!"

اب شنکر گارڈ کے پاس پہنچا، اتفاق سے یہ اس کا ہم وطن تھا، اور کے پاس ایک چھوٹا سا دیہات تھا، یہ دونوں وہیں کے رہنے والے تھے، شنکر کو دیکھ کر لپٹ گیا،

"اب تو بڑے صاحب بہادر بنے پھرتے ہو، اور ہماری قسمت میں وہی گھاس کھودنا لکھا ہے!"

شنکر نے کہا،

"واہ صاحب بہادر تم ہو، یہ ہزارہا ہزار مخلوق تمہارے ایک اشارہ پر موت کے گھاٹ اُتر سکتی ہے!"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا، اس نے کہا،

"اماں ہٹو بھی، انسانوں کے قتل سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں! لیکن

نیاز نے پوچھا،

"اور امتیاز؟ وہ بھی آیا ہے تمھارے ساتھ؟"

شنکر نے بہت دھیمی آواز میں کہا،

"نہیں!"

"وہ پاکستان چلا گیا؟ ہمیں چھوڑ کر؟ ——— نہیں نہیں اگر

سچ نہیں، اسے فوری طور پہ بلا لیا گیا ہوگا، یہی بات ہے نا؟"

شنکر نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا،

"ہاں بھیا ——— لیکن یہ آپ کی کیا حالت ہے؟"

نیاز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے،

"کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ دیکھ ہی رہے ہو!"

جو کچھ تھا، سب لٹ گیا، اتنے دنوں پرانے قلعے میں رہے آ

اسپیشل پاکستان جا رہی تھی، بڑی مشکل سے ٹکٹ ملے، لیکن دیکھتے

خلقت کا کیا عالم ہے، کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں، عورتوں کو

جیسے زنانہ ڈبّہ میں بٹھا دیا؟ اب، میرا دو حاجی صاحب کا سوال

وہ بوڑھے، میں بیمار، ہم میں سے کوئی بھی چھلانگ لگا

کھڑکی نہیں کود سکتا ——— تم حاجی صاحب کو جانتے ہو

شنکر نے کہا،

"جی ہاں، خوب جانتا ہوں"

پھر اس نے ادب سے، حاجی صاحب کو سلام کیا، انھوں نے

نشست کا انتظام کردوں، ماں مفت دلی بے رحم، لو، کھاؤ، پیو، مزے اڑاؤ، تمھارا کیا جاتا ہے؟ بٹھالو، دونوں کو، اپنے درجہ میں!"

گارڈ نے روپے لیے، اور کہا،

"لیکن یہ خلاف قانون ہے!"

شنکر نے ہنستے ہوئے کہا،

"یار، قانون کا نام مت لو، میں کہتا ہوں، یہ ساری دنیا خلاف قانون ہے لیکن خلاف قانون کیا نہیں ہوتا رہتا، مفت میں اپنے دو سو روپے کھو رہے ہو!"

گارڈ نے کہا،

"میں بٹھا تو لوں لیکن اگر راستے میں گاڑی پہ حملہ ہُوا؟"

"تو تمھارا کوئی کیا کرے گا؟ تم کوئی مسلمان تو ہو نہیں!"

گارڈ پھر ہنسنے لگا،

"اچھا تو جائیے، لے آئیے، گاڑی اب چھوٹنے ہی والی ہے،"

"شکریہ!"

شنکر گیا، اور نیاز کو مع حاجی صاحب کے لے آیا، اور گارڈ کے درجہ میں بٹھا دیا، ان دونوں نے شنکر کا بہت شکریہ ادا کیا، گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی رینگنے لگی، شنکر سلام کر کے رخصت ہُوا، اور جاتے جاتے اس نے ایک لفافہ نیاز کے ہاتھ میں دیا، اب شنکر بہت پیچھے رہ گیا تھا اور گاڑی بہت آگے بڑھ چکی تھی،

نیاز نے لفافہ کھولا، تو اس میں سَو سَو کے چھ نوٹ تھے، نیاز، اور

اگر کوئی خود قتل ہونے کے لیے اپنا سر بڑھا دے، تو میں اسے روک بھی نہیں سکتا، یہ سب لوگ، اپنی جان ہتھیلی پہ لیے گھوم رہے ہیں، میں کیا کروں؟ تم کیا کرو؟"

شنکر نے کہا،

"اچھا، ایک بات بتاؤ!"

"پوچھو"

"ہمارا ایک کام کردو گے؟"

"ایک نہیں ایک ہزار ایک!"

"وہ ہنس دیا، شنکر بھی مسکرانے لگا، پھر شنکر نے کہا،

"میرے ایک ساتھی کے بھائی، اور خسر بوڑھے بھی ہیں اور بیمار بھی ہیں، ٹکٹ ان کے پاس ہیں، لیکن کہیں جگہ نہیں ملتی!"

گارڈ نے کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کہا،

"تو میں کیا کروں؟"

شنکر نے کہا،

"ارے یار پوری بات تو سُن!"

"کہو!"

"خاصے دولت مند بھی تھے، اب لٹ پٹ کے پاکستان جا رہے ہیں، لیکن ہاتھی لاکھ لٹا سوا لاکھ کا، یہ مثل تو تم نے سُنی ہی ہوگی یہ دو سو روپے، انھوں نے مجھے دیئے ہیں، کہ کسی طرح ان کے لیے

میری ہمت نہ پڑی کہ یہ خبر بد میں آپ کو زبانی سُناؤں، لہٰذا بذریعۂ خط مطلع کرتا ہوں، بھیّا صبر کیجیے، کاش امتیاز بچ جاتا اور میں اس کی جگہ قتل ہو جاتا، سچ کہتا ہوں، مجھے اپنی موت کا ذرا غم نہ ہوتا، امتیاز کے بعد، زندگی بے کیف اور بے رنگ ہو گئی ہے!"

آپ کا شریکِ غم

شنکر

نیاز نے یہ خط پڑھا، پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، اور وہ

"ہائے امتیاز!"

کہہ کر بیہوش ہو گیا، حاجی عبدالستار نے خط اٹھا لیا، اور پڑھنے لگے، پڑھتے جاتے تھے، اور روتے جاتے تھے، اس گریہ و بکا سے گارڈ صاحب بہت منغض ہوئے، لیکن دو سو روپے لے کر بھینس چکے تھے، چاروناچار خاموشی سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے!

"نظام الدین سے گاڑی چل کر دہلی پر ٹھہری، اور یہ بڑی حسرت سے راستے کی عمارتوں کو تکتے آئے، نئی دلی پر بے شمار سکھ کھڑے تھے، اور انھیں دیکھ کر مسافر کھسنے لگے، اور بعض نے ڈر کر کھڑکیاں بھی چڑھا لیں، پندرہ منٹ کے بعد گاڑی یہاں سے چھوٹی تو دلی کے اسٹیشن سے گزرتی ہی چلی گئی، اسٹیشن سنسان پڑا تھا، اور جا بجا فوجی پہرہ لگا تھا، شاہدرہ پر بھی نہیں ٹھہری، غازی آباد پہ رکی تو یہاں بھی اُلّو بول رہا تھا، دس منٹ بعد یہاں سے بھی چل دی اور خوب تیز رفتاری

حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، حاجی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

"یا اللہ، ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا!"

نیاز نے کہا،

"پھر بھی شکر کا مقام ہے!"

نیاز نے نوٹ حاجی صاحب کے ہاتھ میں رکھ دیئے، وہ سنبھال کر اپنی صدری کے جیب میں رکھنے لگے، تو ان میں سے ایک رقعہ گرا، نیاز نے اٹھا لیا، اور پڑھنے لگا!"

"نیاز بھیا:—

کس دل، اور کس زبان سے کہوں، اشتیاق ہم سب سے روٹھ کر اپنے خدا سے جا ملا، دہرہ دون میں اسے دلی کے فساد کی خبر ملی، یہ خبر سننے کے بعد، اسے چپ لگ گئی، آپ کے او سلطانہ کے غم میں بے حال ہوا جا رہا تھا، دلی کا راستہ بند تھ مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی، میں اسے منصوری لے گ کہ شاید وہاں اس کا جی بہل جائے، اتنے دنوں میں آمد و رفت ممکن ہو جائے گی، پھر وہ دلی آجائے گا، لیکن منصوری میں بھی اس جی نہ لگا، اور جس روز ہم دونوں پروگرام بنا چکے تھے، کہ صبح دلی چلیں اسی دن منصوری میں بھی فساد کے شعلے بھڑکنے لگے، اور میرا پیار بھائی نہ جانے کس ظالم کے ہاتھوں قتل ہو گیا،

ریل کے نزدیک سے گزرتے اور کہتے ہوئے جاتے کہ یہاں چھ ہزار مسلمان ریلوے اسٹاف کے پڑے ہوئے ہیں، لاہور جاکر ریلوے والوں سے کہنا کہ انھیں جلد سے جلد نکالیں، سب کی جانیں خطرے میں ہیں، راجپورہ پر جب گاڑی پہنچی تو شام ہونے لگی مگر گاڑی یہاں ایسی تھی کہ ایک گھنٹہ گزر گیا پلیٹ فارم اور پل پر سکھ بے چین پھر رہے تھے اور ریل میں سب گھبرا رہے تھے۔ بارے ریل کھسکی تو مسافر خانے میں سے بندوق چلنے کی آواز آئی، اور پے در پے چھ فائر ہوئے، ٹرین کے ساتھ جو فوجی دستہ تھا، اس میں بیشتر سکھ اور ہندو تھے، شاید کوئی مسلمان بھی ہو اس کی طرف سے البتہ گمبھیر اعتباری تھی۔ بارے ریل چلتی رہی اور ایک ہوائی فائر محافظ دستے نے بھی کیا، برابر کے ڈبے سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں، اگلے اسٹیشن پر سکھ کپتان نے اُتر کر ہر ڈبے پر دریافت کیا کہ کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟ جب ایک ڈبے کے نزدیک آیا تو معلوم ہوا کہ برابر کے ڈبہ میں ایک بچہ مر گیا ہے اور ایک عورت زخمی ہوگئی ہے، ایک گولی گارڈ کے ڈبے پر بھی لگی تھی، مگر اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا، کپتان صرف پوچھ کر چلا گیا، مرہم پٹی کا کوئی انتظام نہیں تھا، عورت کا خون یونہی بہتا رہا۔

رات ہوگئی، ریل میں روشنی نہیں تھی، باہر چاندنی تھی، مسافروں کو مسلسل پریشانیوں نے اس قدر چڑچڑا بنا دیا تھا، کہ ذرا ذرا سی بات پر الجھنے لگے، خود غرضی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کسی کو سوائے اپنے آپ کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک صاحب جو نظام الدین سے بھیل کر دو آدمیوں کی جگہ پر بیٹھے تھے، لاہور

سے چلتی رہی گارڈ نے کہا کہ اگر قیام اتنے ہی مختصر اور رفتار اتنی ہی تیز رہی تو مغرب کے وقت لاہور پہنچ جائیں گے،

گاڑی میرٹھ پہنچی تو اسٹیشن پر تھوڑے سے آدمی چلتے پھرتے دکھائی دیے سودا بیچنے والے دوسرے پلیٹ فارم پر جنگلے کی دوسری طرف تھے، ریل میں سے اترنے کا کسی کو حکم نہیں تھا، اسٹیشن پر دو چار مسلمان بھی نظر آئے، مگر ڈرے سہمے ہوئے، ریل کے قریب آنا چاہتے تھے لیکن پولیس اور ملٹری کے خوف سے نزدیک نہ پھٹکتے، دو چار نے ہمت کر کے ملٹری والوں سے پوچھا کہ اتر کر کچھ سودا خرید لائیں تو پہرہ دار نے جھڑک دیا کہ پانی تک لینے کی اجازت نہیں ہے، تھوڑی دیر بعد کوئی اللہ کا نیک بندہ موقع پا کر، پانچ سات درجن کیلے ہر ڈبے میں دے گیا، اور کہہ گیا راستے کے لیے جہاں بھی ملے پانی بھر لینا پہرہ دار کہتے تھے اگر پانی میں یا کسی اور سودے میں کوئی زہر دے دے تو کون ذمہ دار ہوگا؟ اس لیے تمھیں ریل سے اترنے کی اجازت نہیں ہے۔ میرٹھ چھاؤنی پر بھی یہی کیفیت رہی، ہندو خوب اطمینان سے چل پھر رہے تھے مگر مسلمان کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا، مظفر نگر جب گاڑی ٹھہری تو دیکھ کر تعجب ہوا کہ نوجوان بالٹیاں اٹھائے پھر رہے ہیں، اور سب کو پانی پلا رہے ہیں اور چپکے چپکے کہہ رہے ہیں کہ راستے کے لیے پانی بھر لو، اس کے بعد ایک ٹولی آئی جس نے ساری ریل کو بھنے ہوئے چنے بانٹے۔ ان کا لباس کانگرسیوں جیسا تھا، مگر دراصل یہ مقامی مسلم لیگ کے کارکن تھے، بس یہ آخری تماشا تھی جو بلی، دیوبند پر بھی مسلمان نہیں دکھائی دیا، سہارنپور پر اکثر مسلمان

مرنا تھا، عورتیں چیختیں تو مرد ان سے زیادہ چیختے، کہ خاموش رہو ورنہ سب مارے جائیں گے، وہ سہم کر چپکی ہو جاتیں، اور پھر اللہ کو یاد کرنے لگتیں، مگر بچے کیسے چپکے ہوں، انھیں تو گرمی اور اندھیرے نے الٹا دیا، ڈبے کا پانی ختم ہو چکا تھا، اور جس کے پاس تھوڑا سا باقی تھا وہ کاہے کو دیتا تھا، بچے پیٹے گئے اور زیادہ زور سے روئے تو ان کے گلے گھوٹے گئے، دور سے گولیاں چلنے کی آواز آ رہی تھی، اور نزدیک ہوتی جا رہی تھی، محافظ دستے نے بھی اتر کر گولیاں چلانی شروع کر دی تھیں، فرق یہ تھا کہ ان کے پاس برین گنیں بھی تھیں، سب اپنی موت کے منتظر تھے، کہ اب گولی لگی یا اب دروازہ اور کھڑکیاں توڑ کر سکھ داخل ہوئے، باہر کسی فوجی کے بولنے کی آواز سنائی دی تو ایک صاحب نے ہمت کر کے پوچھا،

"ہم اتر کر کہیں بھاگ جائیں؟"

فوجی نے کہا،

"تم ریل میں بیٹھے رہو جب تک ہم زندہ ہیں، تم نہیں مر سکتے،" اس سے ڈھارس بندھی مگر کھڑکی کا تختہ بھلا رائفل کی گولی کو کیسے روک سکتا ہے، اور باہر گولیاں برس رہی تھیں، خدا جانے باہر اور آگے ریل پر کیا گزر رہی تھی، یہاں تو موت سامنے کھڑی دکھائی دے رہی تھی، بے کسی کی موت! کیا خبر تھی کہ یوں مارے جائیں گے، ورنہ دلی سے ہرگز نہ نکلتے، اور اب یہ لڑکی ماری جائے گی، اور اس لڑکی کو سکھ کھینچ لے جائیں گے اور ان کے برچھے سینے توڑ کر پار ہو جائیں گے، یا اللہ تو اس بے عزتی سے

تک اسی فراخ دلی سے بیٹھے آئے، ان سے بات کرو تو کاٹنے کو آتے
کہ جاہل اور نچلے طبقے کے ہوں، کسی دفتر کے کلرک تھے، انگریزی بھی
لیتے تھے، انھوں نے پھیلتے پھیلتے اپنے بچّوں کو بھی دھکیل کر مسافروں میں
دیا اور بچّے تنگ آکر آخر کھڑے ہو گئے تو باپ کو ان کی سعادت مندی پر
مسرت ہوئی، ایک صاحب سے یہ بربریت نہ دیکھی گئی اور وہ بول پڑے

"اوروں کا خیال نہیں کرتے تو نہ کرو، مگر اپنے بچّوں کا تو خیال کرو"

انھوں نے نہایت بری شکل بنا کر جواب دیا،

"آپ کو کیا تکلیف ہے؟ آپ کے تو بچّے نہیں ہیں؟"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے آپ کو دو انگل اور پھیلا دیا، گرمی سے
مارے سب کا فشار نکلا جا رہا تھا، دو بج رہے تھے اور لدھیانہ آنے والا
گاڑی خوب تیز چل رہی تھی، کہ ایک دم سے جھٹکا کھا کر رک گئی، ساری
میں ایک شور برپا ہو گیا، جھٹکوں سے جانیں سی گھل گئیں، سمجھ میں نہ آیا کہ
کسی نے کہا "ٹکر ہو گئی"، کسی نے کہا "بم لگا دیا" اور عورتوں اور بچّوں نے
شروع کر دیا، کسی نے رو رو کر کلمہ اور کسی نے دعائیں پڑھنی شروع کیں
سے کسی فوجی کی آواز آئی "کھڑکیاں بند کرو!" ساری کھڑکیاں چڑھ
اور بعض نے اپنے ٹرنک اور بستر ان میں اڑا دیے۔

اتنے میں فوجی موٹروں اور جیپوں کی آوازیں آنے لگیں
کو معلوم ہو گیا کہ ریل پر حملہ ہونے والا ہے، مسافروں میں کسی کے پاس
نہ تھی، بھیڑ بکریوں کی طرح سب بھرے ہوئے تھے، اور انھی کی طرح

کہ لائن پر پتھر ڈال دیئے گئے تھے، اور انجن ڈرائیور نے ریل کو اُلٹنے سے بچا لیا، ڈرائیور بھی سکھ تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ انجن نکال کر لے جائے، مگر کپتان نے فوراً ایک آدمی دوڑایا، کہ انجن نہ جانے پائے، ممکن ہے کہ حملہ آوروں سے ڈرائیور کا سازباز ہو، بہرحال انجن نہ جا سکا، ورنہ ساری ریل کاٹ کر ڈال دی جاتی۔ حملہ آور ہزاروں کی تعداد میں آئے تھے، ان میں گولیاں چلانے والے اور تھے، برچھے مارنے والے اور، اور سامان اُٹھا کر لے جانے والے اور تھے، انتظام سے آئے تھے، اور بڑی باقاعدگی سے لوٹ مار کر کے چلے گئے دو ڈبے آگے جلے کا پورا زور رہا، اور تین ڈبے بالکل خالی ہو گئے، ان میں صرف لاشیں پڑی تھیں، اور باہر پلیٹ فارم پر بیسیوں زخمی مرد اور عورتیں پڑی تڑپ رہی تھیں، سیکڑوں مسافر لاپتہ تھے، بہت سے گھبراہٹ میں اُتر کر بھاگ گئے اور پھر واپس نہ آ سکے، انھیں بھی مُردہ سمجھنا چاہیئے، وہ کیا بچے ہوں گے، زخمیوں کی مرہم پٹی بالکل نہیں ہو سکی، وہ یونہی تڑپتے سسکتے لاہور تک لائے گئے، جالندھر پر گاڑی دس بجے تک کھڑی رہی، عذر یہی تھا کہ لائن صاف نہیں ہے، دس بجے جالندھر سے روانہ ہوئے اور مانانوالہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکی کی رُکی رہ گئی، معلوم ہوا کہ انجن بارہ گھنٹا سے زیادہ کام کر چکا ہے، اور آگے نہیں جا سکتا، اب دوسرا انجن منگایا ہے جو اسے آکر لے جائے گا، اتنی اجازت مل گئی کہ جو نیچے اُترنا چاہے اُتر آئے، پانی بھی ختم پر تھا، صراحی میں جو پانی باقی تھا وہ چھوٹے بچوں کو بطور دوا کے دیا جا رہا تھا، اسٹیشن کے پاس ایک کنواں تھا، لیکن سب کو اندیشہ تھا کہ

پہلے موت دیکھو!

ایک گھنٹہ تک دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں اور شور مچتا
اور ایک گھنٹہ قیامت کا دن ہوگیا، پھر گولیاں کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئیں
اور موٹروں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں، اور کسی فوجی کے کہنے کی آواز سنا
دی" بھاگ گئے حرام زادے!"

ایک گھنٹے میں ڈبہ تپ کر تنور بن گیا تھا، اور پسینہ چوٹی سے ایڑی تک
دفعہ آچکا تھا، کپڑے ایسے کہ انھیں نچوڑ لو، خیر تو باہر مدھم چاندنی میں کچھ
نہیں دیا، البتہ جب گاڑی چلی تو دور جھاڑیوں میں سے کئی آوازیں آئیں
ہمیں یہاں سے نکال لو، اور کپتان نے کہا، "تم خود آجاؤ، ہم نہیں آسکتے
اور وہ بیچارے وہیں رہ گئے، اور ریل چل دی، لدھیانہ آیا، اور چلا گیا
بجے جالندھر پہنچ کر گاڑی کھڑی ہوئی، اور کپتان نے پہرہ لگوا کر اعلان کرا
کہ گاڑی اب صبح کو چلے گی، جو اترنا چاہے پلیٹ فارم پر اتر سکتا ہے
لے سکتا ہے، بیٹھے بیٹھے پاؤں جڑ گئے تھے، اور اس گھنٹے میں تو ایسا
ہوتا تھا کہ سب برسوں کے بیمار ہیں، اور سکت ہی باقی نہیں ہے، دروازے
کیا کھل سکتے تھے کہ چھت تک سامان چنا ہوا تھا، البتہ کھڑکیوں
کود کود کر چند مرد باہر نکلے، اور پانی پر ٹوٹ پڑے، عورتوں اور بچوں کو
دیا، اور تاکید کی کہ تھوڑا تھوڑا پئیں، کہ ایسا نہ ہو کہ طبیعت بگڑ جائے
خود بھی منہ ہاتھ دھویا، اور جب اوسان ٹھیک ہوئے تو آئے کے
دیکھنے چلے کہ ان پر کیا گزری راستے میں سکھ کپتان ملا، اس

سکھ بڑی تعداد میں ادھر اُدھر جمع ہو گئے تھے، مگر دن کا وقت اور پہرہ دار مستعد تھے، اس لیے کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا، ریل سب اسٹیشنوں سے خیریت کے ساتھ گزر گئی، ہماری ہندوستان کا آخری اسٹیشن بھی آ گیا یہاں حفاظتی دستہ بھی ریل کو اللہ کے سپرد کر کے رُخصت ہو گیا، آدھ گھنٹہ کے بعد یہاں سے گاڑی روانہ ہوئی تو جیسے مُردوں میں جان پڑ گئی، پاکستان زندہ باد، اور قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگنے شروع ہو گئے معلوم ہوا کہ پاکستان کی سرحد آ گئی، تھوڑی دیر کے بعد پاکستان کا پہلا اسٹیشن جلو آ گیا، یہاں، سیکڑوں آدمی ریل کے انتظار میں کھڑے تھے، ریل کے رکتے ہی ہر ڈبہ پر کئی کئی آدمی آ گئے، اور سب کو روٹیاں، دال اور اچار تقسیم کرنے لگے، دُو دن کے بھوکے ان روٹیوں پر اس طرح گرے جیسے کبھی روٹی دیکھی ہی نہ تھی، ایک ایک آدمی دس دس روٹیاں ہو کے میں دبا کے بیٹھ گیا، عورتیں اور بچے جو دوسری طرف تھے مانگتے ہی رہ گئے، وہ تو کہیئے کہ کھانے کا انتظام اس قدر وافر تھا کہ سب کو حصہ پہنچ گیا، ایک گھنٹے کے بعد گاڑی روانہ ہوئی اور ۹ ½ بجے لاہور پہنچ گئی، یہ وہی لاہور تھا جہاں تیا نے پچیس سال پہلے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا، اور چار سال پڑھا تھا، اور جہاں اب تک ہر سال دوستوں سے ملنے آیا کرتا تھا، اب وہی لاہور کا اسٹیشن تھا کہ پہچاننے میں نہ آتا تھا، جہاں تک نظر کام کرتی آدمی ہی آدمی دکھائی دیتا تھا، جو ریل سے اترتا بیٹھا پڑ رہتا، تعفن کے مارے دماغ اڑا جاتا تھا،

اس گاڑی میں صرف دو سو آدمی زندہ بچے تھے، ایک صاحب، کی

اس میں زہر نہ ڈال دیا گیا ہو، اس لیے کسی نے اس میں سے پانی پینے کی ہمت نہ کی، مگر جب پیاس نے بہت بے چین کیا، تو سامنے جوہڑ میں جو برسات کا پانی بھرا ہوا تھا، اسے چند آدمیوں نے سونگھا، چکھا، اور پینے لگے، ان کی دیکھا دیکھی ساری ریل نے وہی مٹیالا پانی پیا، مزے میں کوئی فرق نہ تھا، رنگ البتہ چاد کا تھا، چار گھنٹے بعد ایک چھوٹا انجن آیا، اور ریل مر... چال سے روانہ ہوئی، امرتسر پر خوب گھماگھمی تھی، ہزاروں شرن آرتی پڑے ہوئے تھے، اور ان کی ریلیں بھر بھر کے جا رہی تھیں، یہ گاڑی پلیٹ فارم پر تھوڑی دیر ٹھہری، لیکن آگے یارڈ میں آ کر پھر کھڑی ہو گئی، سامنے ... کھلے ہوئے بہہ رہے تھے، اور دھوپ میں ان کی موٹی موٹی دھاریں ... کی طرح دکھائی دے رہی تھیں، ایک صاحب سے نہ رہا گیا، اور انھوں نے گارڈ سے پوچھا،

"کیوں صاحب ہم سامنے نل ہیں سے پانی بھر لیں؟"

اس نے تیوری چڑھا کر کہا،

"یہ امرتسر ہے، جانتے نہیں؟"

ریل کھڑی رہی، پانی بہتا رہا، اور پیاسے سسکتے رہے، معلوم ہوا ... بریک خراب ہو گئے ہیں، اس لیے مستری کی تلاش ہو رہی ہے، ایک گھنٹہ ... بعد امرتسر سے نجات ملی: بیاس کے اسٹیشن پر بھی یہی ماجرا پیش آیا تھا، ... بھی بہہ رہے تھے، اور کورے کورے مٹکے بھی بھرے رکھے تھے، لیکن ان مسافروں ... لیے جو شرقی پنجاب جا رہے تھے، سکھ ہر جگہ تلواریں لیے پھر رہے تھے، بیاس میں ...

حالت یہ تھی کہ سارے کپڑے خون میں لت پت تھے، اور وہ پاگلوں کی طرح چیختے تھے کہ میں نے مُردوں کا پاؤ بھر خون چاٹا ہے، یہ لاشوں کے نیچے دبے رہ گئے تھے، اور پیاس بجھانے کے لیے خون چاٹتے رہے تھے، ان کی خون آشامی کی کیفیت سن کر بہت سے لوگوں کو بہار کی ایک پاگل عورت یاد آگئی، جو سب سے کہا کرتی تھی کہ میں نے اپنے، سات بچوں کا خون پیا ہے، اس کے سات بچے اس کے سامنے ذبح کیے گئے تھے، اور سب کا خون اسے زبردستی پلایا گیا تھا۔"

لاہور کے اسٹیشن پر جب حاجی صاحب اور نیاز اُترے تو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ **عورتوں** کو تلاش کریں، نیاز اگرچہ بیمار تھا لیکن اس وقت نہ جانے، اس میں کہاں کی طاقت آگئی تھی، وہ بڑی تیز قدمی سے اسٹیشن کا گشت کر رہا تھا، اور ایک ایک ڈبہ دیکھ رہا تھا، لاشوں اور زخمیوں کے سوا، سب اُتر چکے تھے، وہ حیران ہو ہو کر ہر ڈبہ کو دیکھ چکا تھا، لیکن اسے کوئی نہ ملا، اتنے میں لپک کر حاجی صاحب پہنچے، انھوں نے ایک ڈبہ کی طرف اشارہ کر کے کہا،

"یہ ہے! آؤ!"

دونوں اس ڈبے میں پہنچے، جو عورتیں اتفاق سے صحیح سلامت رہ گئی تھیں، وہ روتی ہوئی، اور سہمی ہوئی اُتریں، جو زخمی تھیں وہ کراہ رہی تھیں، جو قتل ہو چکی تھیں وہ چپ سادھے پڑی تھیں، جو اغوا ہو چکی تھیں ان کی آواز یہاں تک پہنچ نہیں رہی تھی،

جب عورتیں اتر لیں تو حاجی صاحب، اور نیاز، اندر داخل ہوئے، اور وہاں کا لرزہ خیز منظر دیکھ کر کانپ گئے، انھوں نے لاشوں کے ہجوم میں سب سے پہلی جو لاش دیکھی وہ ریحانہ کی تھی!

ریحانہ کی!

حاجی صاحب کی دُلاری بیٹی، اور نیاز کی چہیتی بیوی!

ایک طرف رخسانہ بیہوش پڑی تھی، اور دوسری طرف نسرین بیگم کراہ رہی تھیں، مصیبت جب حد سے بڑھ جاتی ہے، تو خدا صبر بھی بھی دے دیتا ہے، وہی نیاز جو امتیاز کی ہلاکت کی خبر پڑھتے ہی بیہوش ہو گیا تھا، اس وقت صبر و ضبط کی تصویر بنا ہوا تھا، وہی حاجی صاحب جن کی آنکھ سے بات بات پر آنسو نکل آتے تھے، اس وقت عزم و استقلال کا مجسمہ نظر آرہے تھے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خموش ہو گئے۔

حاجی صاحب نے نسرین بیگم کو سہارا دیکر اتارا، اب رخسانہ بھی کچھ کچھ ہوش میں آچکی تھی، اسے پکڑے ہوئے پلیٹ فارم پر لائے، اور ایک چادر بچھا کر، اسے اور نسرین کو بٹھا دیا، نیاز حاجی صاحب کی مدد سے ریحانہ کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش اتار کر لایا، ریحانہ مر چکی تھی، اس کا بدن فگار تھا، کئی گولیوں کے نشانات اس کے نازک جسم پر موجود تھے، لیکن اس کی روح مسکرا رہی تھی، اس کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا!

شہرِ ناپُرسَاں

چند دردمند مسلمانوں، اور، رضا کاروں نے، ریحانہ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا، اور، حاجی صاحب، نیاز، رخسانہ، اور نسرین بیگم کو والٹن کیمپ پہنچا دیا، یہ مہاجرین کا ایک پورا، اور بہت بڑا شہر تھا، یہاں زخموں کے پھول کھلے ہوئے تھے، اور آہوں کی ہوائے سرد چل رہی تھی، یہاں قہقہے نہیں نالے تھے، کہانی نہیں حقیقت تھی، دِلّی کے پرانے قلعے اور لاہور کے والٹن کیمپ میں، ایک فرق تھا، وہاں ذلت کی موت تھی، یہاں اطمینان کی، لیکن موت یہاں بھی تھی، اور وہاں بھی!

مشرقی پنجاب سے، لاکھوں کی تعداد میں مسلمان آرہے تھے، جتنے ہندو اور سکھ مغربی پنجاب سے گئے تھے، اس سے بہ قدر بیس لاکھ کے زائد مسلمان مشرقی پنجاب سے، سب کچھ کھو کر آرہے تھے، ہندو اور سکھ جائداد منقولہ

اور سرمایہ نقد کا بہت بڑا حصّہ اپنے ساتھ لے گئے تھے، اور لیے جا رہے تھے، اس کے برعکس مسلمان، خالی ہاتھ آ رہے تھے، ہندو اور سکھ پاکستانی فوج کی حفاظت میں، بہ خیریت تمام منزلِ مقصود کی طرف روانہ کیے جا رہے تھے، اور مسلمانوں کے لاکھوں نفوس کے ایک ایک قافلہ کی حفاظت کے لیے، چند آدمی متعین کیے جاتے تھے، اور پھر ان قافلوں پر دھڑتے سے حملے ہوتے تھے، ان کا بچا کھچا سامان معیشت چھین لیا جاتا تھا، ان کی عورتوں، اور لڑکیوں تک پر ہاتھ صاف کر لیا جاتا تھا، وہ حسرت سے آسمان کی طرف دیکھتے، اور تیز تیز قدم آگے بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے، یہ آتے تھے . . . .

. . . . اور کیمپ میں بھیڑ بکری کی طرح، ڈال دیئے جاتے تھے اور پھر اطمینان سے اپنے غموں کو یاد کر کے، اور اپنے زخموں کو کرید کے روتے تھے، چیخیں مارتے تھے، فریاد کرتے تھے، اور ان زخموں پر نواب ممدوٹ کی وزارت، شیریں الفاظ، اور خوشگوار وعدوں کا مرہم رکھتی تھی اور یہ سب کچھ بھول جاتے تھے، اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگتے تھے،

نیاز جب سے کیمپ میں آیا تھا، اسے چپ لگی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا وہ باتیں کرنا بھول گیا ہے، وہ اس دنیا کی مخلوق ہی نہیں ہے، وہ سب کو ایک عجیب نظر سے دیکھتا تھا، ایسی نظر سے جس میں بیک وقت حقارت، طنز، درد، سب ہی کچھ شامل تھا، وہ مسکرا کر، ادھر ادھر دیکھنے لگتا

تھا، لوگ اس سے ملتے تھے، باتیں کرتے تھے، اپنی کہانیاں سناتے تھے جگ بیتی کے نقشے پیش کرتے تھے، مگر اس کی مہر خاموشی کسی طرح نہیں ٹوٹتی تھی،

حاجی ستار، ایک جہاں دیدہ آدمی تھے، انھیں رخسانہ کے رونے اور نسرین بیگم کے اختلاج، اور اپنی بھیانک مفلسی سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی تھی، جتنی نیاز کی خاموشی سے، وہ چاہتے تھے، یہ چیخے، اور اس کی چیخ سے سارا کیمپ لرز اٹھے، یہ روئے، اور اس کے آنسوؤں سے جل تھل ہو جائے یہ فریاد کرے، اور اس کی فریاد عرش معلا کو ہلا دے، یہ صرف اسی طرح زندہ رہ سکتا ہے، ورنہ یہ ہاتھ سے جاتا رہے گا، دیوانہ ہو جائے گا، اور دنیا سے منہ موڑ لے گا، اس کی خاموشی، صبر و ضبط کا نتیجہ نہیں ہے، گہرے صدمے، اور خوفناک، غم کا نتیجہ ہے کہیں ایسا نہ ہو، اس کا کلیجہ غم کی تاب نہ لاکر پھٹ جائے، اور یہ کبھی داغ مفارقت دے جائے،

ایک روز نیاز کی حالت بہت ابتر تھی، وہ یا تو خاموش تھا یا ہنسنے اور قہقہے لگانے لگا، خاموشی اب تک قائم تھی، بات کسی سے نہیں کرتا تھا، لیکن ہنس رہا تھا، ہنسے جا رہا تھا ہنسی کے اس پر دورے پڑ رہے تھے، بیگم نسرین نماز پڑھ کر، گڑگڑا گڑگڑا کر، اپنے گم شدہ بیٹے ریاض کی صحت و سلامتی، اور بازیابی کی دعا اپنے پاک پروردگار، بے نیاز سے مانگ رہی تھیں، ہر روز جب وہ دعا مانگتی تھیں، اس یقین کے ساتھ کہ تیرِ دعا، ہدفِ اجابت پر بیٹھے گا، اس لیے ان کا خضوع و خشوع، اور بڑھ جاتا

تھا، یہی کیفیت اس وقت بھی تھی! نیاز ان کے پاس مصلے پر جا کر بیٹھ گیا، وہ دعا مانگ رہی تھیں، اور یہ قہقہے لگا رہا تھا، انھوں نے جلدی جلدی دعا ختم کی، اور خفگی کے لہجہ میں بولیں،

"بھیا ہنسنے کے سبب میں ہی رہ گئی تھی؟"

نیاز کے قہقہے اور بلند ہوگئے، اور وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگیں، کہنے لگیں،

"آج تجھے کیا ہوگیا ہے، لڑکے!"

اور یہ لڑکا، اور زیادہ زور زور سے ہنسنے لگا، دوسری طرف قریب ہی رخسانہ بیٹھی کھچڑی پکا رہی تھی، اسے بھی حیرت کہ آج بھائی جان کو کیا ہوگیا ہے؟ یا تو کسی سے بات ہی نہیں کرتے تھے، یا ہنسنے پر ہنسے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے، جب سے نیاز کو چپ لگی تھی، وہ بھی اس سے الگ الگ رہتی تھی، اتنے میں حاجی صاحب کہیں سے گھومتے گھومتے تشریف لائے، ان سے رخسانہ نے کہا،

"آج بھائی جان کو کیا ہوا ہے؟"

حاجی صاحب گھبرا گئے،

"کیا ہوا بیٹی؟"

رخسانہ نے جواب دیا،

"پھوپھی پاس بیٹھے دیوانوں کی طرح، برابر ہنسے جا رہے ہیں!"

حاجی صاحب نے پوچھا،

"پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہے۔"

رخسانہ بولی،

"جی!"

حاجی صاحب نے کہا،

"خدا خیر کرے، یا اللہ رحم!"

اور نسرین بیگم کی طرف لپکے، وہ بدستور مصلے پر بیٹھی نیاز کی طرف

بہ چشم حیرت نگراں تھیں، اور وہ حسب سابق قہقہے لگا رہا تھا، حاجی صاحب

پہنچے، بہن نے بھائی سے فریاد کی،

"دیکھ رہے ہو بھیا؟"

حاجی صاحب کو دیکھ کر نیاز چپ ہو گیا تھا، انھوں نے بہن سے پو

"میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ رہا!"

نسرین بیگم نیاز کی شکایت کرنے ہی والی تھیں کہ نیاز نے آؤ دیکھا

نہ تاؤ، پھر قہقہوں کا تار باندھ دیا،

وہی دیوانوں کی سی ہنسی!

وہی سرخ سرخ آنکھیں!

وہی چہرے پر وحشت کی بارش!

حاجی صاحب، نیاز کے پاس گئے، اور بڑے محبت بھرے لہ

کہا،

"کیا بات ہے نیاز، کیوں ہنس رہے ہو؟"

نیاز نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ جب ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، تب وہ رُکا، اور بولا،

"آپ کیوں نہیں ہنستے، آپ بھی ہنسیئے، آج کا دن بڑا مُبارک ہے ہنسیئے، اور ہنسائیے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"تو وہ بات بھی بتا دو، جس پر ہنس رہے ہو، پھر ہم بھی ہنسیں۔ روتے روتے تھک گئے بیٹا!"

نیاز نے کہا،

"ریحانہ زندہ ہو گئی، امتیاز جنّت سے واپس آ گیا!"

اور نیاز کھڑا ہو کر، وفورِ مسرّت سے ناچنے لگا،

اس نے حاجی صاحب سے کہا،

"چڑا اگل خیرو میاں، تم بھی آؤ، میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ناچو، اور بڑی بی تم بھی ——— رخسانہ کہاں ہے؟ اسے بلاؤ، وہ بھی تینوں کے ساتھ ناچے گی، بڑا مزہ رہے گا، خدا کی قسم!"

وہ بدستور ناچ رہا تھا، حاجی صاحب نے کہا،

"ہوش میں آؤ نیاز، سب دیکھ رہے ہیں؟"

نیاز نے کہا،

"ٹھیک ہے، جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ اسی لیے تو سب کے

سامنے ناچ رہا ہوں، تاکہ لوگ دیکھیں، اور لطف اٹھائیں!"

نسرین ... اب بہت سے لوگ یہ تماشہ دیکھنے جمع ہو گئے تھے، ... محوحیرت، ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی مصداق بنی یہ تماشہ دیکھ رہی ... کھچڑی دیگچی میں جل رہی تھی، اور ریحانہ کبھی اپنا بچھڑا ہوا دوپٹہ سنبھالتی ... یہاں آگئی تھی، اور ایک کونہ میں کھڑی رو رہی تھی حاضرین میں بعض لوگ ... بہ نگاہ عبرت یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، اور بہت سے ہنس ہنس کر یہ دل ... تماشہ دیکھ رہے تھے، تماشائیوں کا مجمع دم بدم بڑھتا چلا جا رہا تھا، اب ... صاحب سے ضبط نہ ہو سکا، وہ اٹھے، نیاز کے پاس گئے، اور اسے ... پکڑ کر جھنجوڑا،

"نیاز، نیاز!"

نیاز نے حاجی صاحب کو ایک دھکا دیا، وہ گرتے گرتے بچے، ... فوراً سنبھل گئے، پھر نیاز کے پاس جا کر اسے انھوں نے پکڑا، اور ...

"بند کرو، یہ تماشہ!"

نیاز، ناچتے ناچتے رکا،

"تم نہیں دیکھنا چاہتے تو دفع ہو جاؤ، اپنے تمبو میں، تم مجھے نہیں ... سکتے، میں رقاص اعظم ہوں، میرا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اودے ... بھی نہیں، رام گوپال بھی نہیں،

میں ٹور کروں گا، اپنے طائفہ کے ساتھ، ہندوستان کا، برما کا، ... یورپ اور امریکہ کا، جو میرے ساتھ چلنا چاہے وہ ہاتھ اٹھا دے ...

کئی آدمیوں نے ہاتھ اُٹھا دیئے، یونہی محض مذاق میں،

نیاز نے کہا،

شاباش، ایک، دو، پانچ، دس، پندرہ،

بس بھئی! اتنے بہت ہیں باقی آئندہ اور وہ پھر ہنسنے لگا،

حاجی صاحب نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا،

"تم نہیں باز آؤ گے نیاز؟"

نیاز نے مُنہ بنا کر جواب دیا،

"مشکل ہے، بڑے میاں!"

سب لوگ ہنسنے لگے، نگاہ عبرت سے تماشہ دیکھنے والے بھی اپنے تبسم پر قابو نہ رکھ سکے، اب حاجی صاحب کے لیے رونے کے سوا، کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا، ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے،

"بیٹا نیاز!"

نیاز نے بے نیازی سے ان کی طرف دیکھا،

"کیا ہے؟"

حاجی صاحب بولے،

"تم اب تھک گئے ہو، ذرا سستالو، پھر ناچنا، ناچ لینا جی بھر کے!"

نیاز نے تیکھی چتون سے دیکھ کر کہا،

"بوڑھے تھکتے ہیں، جوان نہیں تھکتے، جائیے، آپ کو معاف کیا، آپ

آرام فرمایئے، میں اپنا کام کروں گا!"
اور یہ کہہ کر وہ پھر تیزی کے ساتھ، رقص کرنے لگا، اتنی دیر میں مجمع
بڑھ گیا تھا، نیاز واقعی تھک گیا تھا، اس کی سانس پھول گئی تھی، پسینہ میں
شرابور تھا، لیکن نہ معلوم کون جذبہ تھا، جو اسے رقص بے محابہ پر مجبور کر رہا تھا
حاجی صاحب کی محبت نے پھر جوش مارا، انھوں نے پھر نیاز کو پکڑا
"اپنا تماشہ کیوں بناتے ہو بیٹا ——— چلو خیمہ میں جی بھر کے ناچو"
نیاز کو غصہ آگیا،
"تم لڑکے لڑکے کیئے جاؤ گے؟"
ایک آدمی جو حاجی صاحب کے قریب کھڑا ہوا تھا، آہستہ سے بولا
"دماغ اُلٹ گیا ہے ان کا، چپ رہیئے!"
نیاز نے یہ بات سُن لی، اُس آدمی کی طرف مخاطب ہو کر گرجا
"کیا کہا؟"
وہ چپ رہا، نیاز نے کہا،
"میں پاگل ہوں؟"
حاجی صاحب نے کہا،
"نہیں، نہیں، پاگل کون کہتا ہے؟ تم تو بڑے اچھے آدمی ہو آؤ
ہمارے ساتھ!"
نیاز اُس آدمی سے لپٹ گیا، جس نے اُسے پاگل کہا تھا، اور مار
مارتے ادھ موا کر دیا، مجمع کے لوگوں نے پہلے تو نیاز کو چھڑانے کی کو

کی، لیکن اس وقت اس میں بلا کی طاقت آ گئی تھی، جو آدمی اس کے پاس آتا تھا، اسے اٹھا کر دہ پٹخ دیتا تھا، لوگ سہمے ہوئے الگ کھڑے تھے، اتنے میں کچھ پولیس والے آ گئے، اور انھوں نے اندھا دھند نیاز کو اپنے چوبی ڈنڈوں سے پیٹنا شروع کر دیا، نیاز پٹ رہا تھا لیکن اس آدمی سے لپٹا ہوا تھا جس نے اسے پاگل کہا تھا، نیاز کو پٹتا دیکھ کر رخسانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، نسرین بیگم کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے، رخسانہ نے پکار کر باپ سے کہا،

"بھائی جان کو بچائیے، وہ لہولہان ہوئے جا رہے ہیں!"

حاجی صاحب آگے بڑھے، دو ایک ڈنڈے ان کے جسم ناتواں پہ بھی پڑے انھوں نے حوالدار سے کہا،

"اس کا دماغ الٹ گیا ہے!"

حوالدار نے کہا،

"اسی کا علاج تو ہو رہا ہے!"

اتنے میں پولیس کے جوانوں نے پیٹ پیٹ کر نیاز کو ادھ موا کر دیا تھا، اور وہ آدمی نیاز سے پٹتے پٹتے ادھ موا ہو گیا تھا، دونوں الگ الگ نیم بے ہوش پڑے تھے،

پولیس کی لاری آئی، نیاز اور وہ آدمی، دونوں اس میں بٹھا دیئے گئے، اور لاری روانہ ہو گئی، حاجی صاحب نے کوشش کی کہ وہ بھی اس میں بیٹھ جائیں لیکن پولیس نے اجازت نہیں دی،

نیاز کے جانے کے بعد، حاجی صاحب خیمہ میں آگئے، رخسانہ روتے روتے
بے حال ہوتی جا رہی تھی،

حاجی صاحب نے کہا،

"تو کیوں رو رہی ہے بیٹی!"

رخسانہ نے روتے روتے کہا،

"پولیس والے، اکیلے ہیں بھائی جان کو اور ماریں گے جب یہاں انھوں
نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، تو وہاں تو وہ کھل کھیلیں گے!"

نسرین بیگم نے کہا،

"بھیا کسی طرح چھڑا لاؤ نیاز کو، چاہے، اس میں کچھ خرچ ہی کرنا پڑے
واقعی پولیس والے بہت ستائیں گے اُسے، اور اس کا تو دماغ الٹا ہوا ہے
وہ کچھ اپنے ہوش میں تو ہے نہیں!"

حاجی صاحب سر جھکا کر بیٹھ گئے، نسرین بیگم نے پوچھا،

"کیا سوچ رہے ہو بھیا!"

وہ مدھم آواز میں بولے،

"کچھ نہیں!"

بہن نے بھائی سے کہا،

"سوچ رہے ہو، روپے کہاں سے آئیں گے؟"

حاجی صاحب نے کہا،

"ہاں یہ فکر بھی ہے، کم سے کم، ڈیڑھ دو سو روپے تو ہاتھ میں ہو

نسرین بیگم بولیں،

"ٹھیک ہے، تو ایسا کرو، یہ میری چوڑیاں لے جاؤ، ان سے کام چلاؤ!"

یہ کہہ کر انھوں نے سونے کی دو چوڑیاں بھائی کے سامنے رکھ دیں،

حاجی صاحب رونے لگے،

"اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

دل دہی کرتے ہوئے بولیں،

"یہ پھر سوچ لینا، اس وقت جو کام درپیش ہے وہ تو کرو!"

حاجی صاحب، بیوہ بہن کی چوڑیاں لے کر خیمے سے باہر نکلے، ایک رضاکار سے پوچھا،

"بیٹا، کسی سُنار کو جانتے ہو؟ یہ دو چوڑیاں ہیں سونے کی، انھیں فروخت کردوں گا!"

رضاکار بھلا آدمی تھا، کہنے لگا،

"چلیے!"

دونوں شہر پہنچے، اور ایک سنار سے سودا کیا، اس نے ساڑھے تین سو روپے دیئے، حالانکہ مال کسی طرح پانچسو سے کم کا نہیں تھا، اس کام سے فارغ ہوکر، حاجی صاحب نے کہا،

"اب ذرا پولیس چوکی تک بھی پہنچا دو بیٹا، بہت دعائیں دوں گا!"

"وہاں کیا کام ہے؟"

حاجی صاحب نے اپنی ساری سرگزشت سنائی، وہ ساتھ چلنے پر تیار ہوگیا

اس نے لے جا کر، حاجی صاحب کو پولیس چوکی کے دروازے پر کھڑا کر
اور کہا،

"آپ اندر جائیے، مجھے اجازت دیجیے، کیمپ میں میری ڈیوٹی کا
وقت ہے!"

رضا کار چلا گیا، حاجی صاحب اس کا شکریہ ادا کر کے اندر پہنچے، ا
سپاہی کو دو روپے نذرانہ کے پیش کر کے، انسپکٹر کے حضور میں حاضر ہو
اور اپنا ماجرا سنا کر عرض کیا،

"میں چاہتا ہوں، آپ اسے چھوڑ دیں!"
انسپکٹر نے کہا،

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے، لیکن ملزم چھوڑا نہیں جا سکتا، اس
ایک مہاجر کو مارتے مارتے ادھ موا کر دیا تھا!"

"لیکن وہ دیوانہ ہے، پاگل ہے!"

"آپ کا خیال یقیناً صحیح ہے، کیمپ کے اور بھی کئی آدمیوں نے
شہادت دی ہے، لیکن صاحب ہم تو قانون کے بندے ہیں، آج
کافی زخمی ہو گیا ہے، اس لیے ہسپتال بھیج دیا گیا ہے، اور وہاں
حراست میں ہے، وہاں سے اچھا ہو کر آ جائے، تو اس کا مڈیکل اگز
(طبی معائنہ) ہو گا، مگر وہ واقعی پاگل ہے، تو اسے پاگل خانے بھیج د
اگر نہیں، تو عدالت میں پیش کر دیا جائے گا، وہ جو چاہے اسے سزا
اس دو ٹوک بات کے بعد حاجی صاحب کے لیے مزید کتنا مشکل

لیکن انھوں نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا،
"اچھا میں ایک بات کا اطمینان چاہتا ہوں!"
"فرمایئے؟!"
"اسے پولیس اب ستائے گی تو نہیں؟"
انسپکٹر صاحب ذرا جھنجھلا گئے،
"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں بڑے میاں؟ پولیس کیوں ستائے گی؟ اسے کسی سے کوئی دشمنی نہیں!"
حاجی صاحب نے صفائی دی،
"یہ تو آپ نے صحیح فرمایا! لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ وہ تو ٹھہرا دیوانہ کہیں اس سے کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد ہو گئی تو پھر نہ مارا جائے"
انسپکٹر صاحب بولے،
"اس کی میں ذمّہ داری نہیں لے سکتا، پاگلوں کا علاج ڈنڈے ہی سے ہم کرنے کے عادی ہیں!"
حاجی صاحب نے چپکے سے ایک لفافہ انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا، سفید لفافہ تھا، اور ہرے رنگ کا نوٹ، اپنا جلوہ دکھا رہا تھا۔ انسپکٹر صاحب نے وہ لفافہ اپنے کاغذات کے نیچے دبا لیا، اور گھنٹی بجائی، فوراً ایک سپاہی حاضر ہوا،
"حوالدار کو بلاؤ!"
حوالدار آیا،

"واٹسن کیمپ کا جو آدمی گرفتار کر کے ہسپتال بھیجا گیا ہے، اس کا کیا نام ہے؟"

"جی اس کا نام ہے، نیاز!"

"ہاں نیاز ——— تو دیکھو، اس کا خیال رکھنا، اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے، وہ پاگل ہے، نگرانی اس کی ضرور ہو لیکن اسے مارا ہرگز نہ جائے!"

"بہت خوب!"

اور وہ باہر چلا گیا، انسپکٹر صاحب نے ایک دلنواز تبسم کے ساتھ سراپا اخلاق بن کر پوچھا،

"اب تو آپ خوش ہو گئے؟"

حاجی صاحب نے یکسر شکر و سپاس بن کر کہا،

"بندہ نوازی ہے حضور کی، جو ہم مہاجروں کا اتنا خیال فرماتے ہیں!"

تبسم کے پھول برساتے ہوئے انسپکٹر صاحب نے فرمایا،

نہیں نہیں کوئی بات نہیں، یہ تو ہمارا فرض ہے!"

حاجی صاحب نے اجازت لی، اور باہر آئے، حوالدار کھڑا، مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا، حاجی صاحب کو دیکھ کر اس نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور کہا،

"ابھی ہسپتال جاؤ ——— ارے تم اب تک گئے نہیں؟"

ملزم نیاز کے بیے جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی فوراً تعمیل کرو، چلو، جاؤ، بہت سست ہو تم!"

سپاہی باہر نکلا: حوالدار صاحب نے مسکرا کر حاجی صاحب کی طرف دیکھا انھوں نے فوراً دس روپے کا نوٹ ادب سے پیش کیا، حوالدار نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا،

"اس کی کیا ضرورت تھی؟ خیر!"

حاجی صاحب جلدی سے باہر نکلے، سپاہی کو دروازہ پر اپنا منتظر پایا اس نے انھیں مخاطب کرکے کہا،

"ہسپتال جا رہا ہوں!"

حاجی صاحب بولے،

"اچھا بھائی، جاؤ، لیکن خیال رکھنا!"

"اجی اطمینان رکھیئے، ہم کیا آدمی کو پہچانتے نہیں؟"

حاجی صاحب سمجھ گئے، اس نے پہچان لیا ہے، اس سے خلاصی ناممکن ہے، جیب میں ہاتھ ڈال کر، پانچ روپے کا ایک نوٹ اسے بھی پیش کیا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جلدی سے جیب میں رکھ لیا، حاجی صاحب نے سپاہی سے کہا،

"میں بھی ہسپتال چلوں؟"

وہ بولا،

"تم چل کر کیا کرو گے؟"

حاجی صاحب چپ رہے، سپاہی نے، اپنی بات پوری کی،

"اُس نے بھی بڑا اُدھم مچایا تھا، یہاں آکر، کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا، مارتے نہ تو کیا کرتے؟ وہ تو خود انسپکٹر صاحب پر مُکّا اُٹھا کر بڑھا تھا، حوالدار بیچ میں آیا، تو اس کے بھی ایک لافا رسید کیا!"

حاجی صاحب نے کہا،

"ٹھیک ہے بھئی، وہ ان کا کون تھا، جو وہ اُس کی رعایت کرتے؟ بات بھی اس نے ایسی ہی کی تھی، کہ پٹتا، لیکن اب خیال رکھنا!"

"کیوں نہیں رکھیں گے بھلا؟ ———— اور اب تو تم نے انسپکٹر صاحب، اور حوالدار کو بھی خوش کر لیا ہے، یہ لوگ بھی اب اسے نہیں ستائیں گے، بالکل اطمینان رکھو، دو ایک دن کے بعد، اجازت مانگو گے، تو ضرور مل جائے گی، دیکھ لینا، جا کر اچھی طرح!"

سپاہی آگے بڑھ گیا، اور حاجی صاحب، سر جھکائے، اپنے اور نیاز کے حال پر آنسو بہاتے کیمپ میں پہنچے، نسرین بیگم، اور رخسانہ نے اب تک کھچڑی کا ایک لقمہ بھی نہیں کھایا تھا، حاجی صاحب کا انتظار ہو رہا تھا، وہ آئے، تو دونوں انھیں لپٹ گئیں،

نسرین بیگم نے پوچھا،

"ہو آئے بھیا؟"

حاجی صاحب بولے،

"ہاں ہو آیا!"

"ذرا اپنے بیٹے کو دیکھ لوں؟"

"بڑے میاں، یہ ہمارے بس میں نہیں، بغیر انسپکٹر صاحب کی اجازت کے تم نہیں جا سکتے"

"تو جاؤں ان سے اجازت لے آؤں؟"

سپاہی نے سر ہلایا،

اور کبھی تو دے بھی دیں، آج وہ ہرگز ہرگز نہیں دیں گے!"

"کیوں بھلا؟"

سپاہی آگے بڑھتے ہوئے بولا،

"چھوڑو بھی!"

"کچھ تو بتا دو بھائی!"

سپاہی پھر ٹھہر گیا، اس نے کہا،

بات یہ ہے کہ آج انسپکٹر صاحب کے حکم سے حوالدار نے خوب مارا!"

"نیاز کو؟"

"ہاں، ہاں، اور کسے؟"

حاجی صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا،

"وہ زندہ تو ہے؟"

سپاہی نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا،

"ہاں زندہ ہے، زندہ رہے گا ——— بھائی ایک بات ہم بھی کہیں!"

رخسانہ ایک پلیٹ میں کھچڑی نکال کر لائی، اور باپ کے سامنے لا کر رکھدی،

"کھانا کھا لیجیئے، ابا، ۔۔۔۔۔۔۔ آپ نے رات بھی نہیں کھایا تھا!"

"بیٹی مجھے تو اس وقت بالکل بھوک نہیں ہے!"

رخسانہ نے کہا،

"پھر ہم بھی نہیں کھاتے!"

نسرین بیگم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا،

"جا بیٹی، سنبھال کے رکھ آ، جب یہ کھائیں گے، تب ہی ہم لوگ کھالیں گے!"

رخسانہ پلیٹ اٹھا کر چلی، حاجی صاحب نے کہا،

"اچھی زبردستی ہے، آدمی کی طبیعت بھی تو سمجھا کرو!"

نسرین بیگم نے کہا،

"تو میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"تم اور رخسانہ کیوں نہیں کھالیتیں؟"

رخسانہ نے کہا،

"کیسے کھالیں؟ ۔۔۔۔۔۔۔ کھانا بھی چاہیں تو نہیں کھا سکتے حلق سے نیچے لقمہ نہیں اترے گا!"

رخسانہ پلیٹ لے کر چلی، حاجی صاحب نے کہا،

"لے آؤ، رخسانہ!"

رخسانہ نے پوچھا،

"اور بھائی جان کا کیا حال ہے؟"

"خیریت سے ہیں؟"

پولیس والوں نے انھیں ستایا تو نہیں؟"

"نہیں!"

اور یہ نہیں کہتے کہتے، ان کی آواز لرز گئی، ان کی آنکھوں کے سامنے نیاز کی تصویر پھرنے لگی، وہی نیاز، جو دِلّی کالج کا پروفیسر تھا جو آکسفرڈ یونیورسٹی کا ایم۔ اے تھا، جو پھولوں کی سیج پر سو جس کا پیارا بھائی مارا گیا، جس کی پیاری بیوی قتل کر دی گئی، جس دماغ اُلٹ گیا، جس کے پاگل پن کا علاج ڈنڈے سے کیا جواب پٹیوں سے بندھا ہوا زخموں سے چُور چُور، ہسپتال میں پڑا تھا، اور اب بھی اول فول بک رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا اور چارپائی پر سے اُٹھ اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا

رخسانہ نے پوچھا،

"بھائی جان اچھے تو ہو جائیں گے!"

"بیٹی میں کیا کہہ سکتا ہوں، خدا جانے، دعا کرو!"

نسرین بیگم بولیں،

"میرا تو رواں رواں دعا کر رہا ہے، خدا اسے اچھا کر دے، صد سہتے سہتے وہ پاگل ہو گیا، بیچارہ!"

دِیوانہ کو کیا کہیئے!

حاجی ستار کا مختصر سا قبیلہ، والٹن کیمپ میں ڈیرے ڈالے پڑا تھا، اب سردی کا دَور شروع ہوچکا تھا، ان لوگوں کے پاس گرم کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے، ایک لحاف تھا، جو شہر کی کوئی دولت مند خاتون اپنی سخاوت اور دریادلی کا مظاہرہ فرماتی ہوئی دے گئی تھیں انھوں نے بہت سے لحاف بانٹے تھے، لیکن ان کی روئی پرانی تھی، نہ جانے یہ ان کے نمک حلال ملازموں کی حرکت تھی، یا خود ان کی دور اندیشی کو اس میں دخل تھا، نئی روئی کم بھی ہو، تو کام چل سکتا ہے اور پرانی روئی بہت سی ہو تو بھی سردی نہیں جاتی، یہی حال اس لحاف کا تھا، اس لحاف کو نسرین بیگم، اور، رخسانہ، دونوں اوڑھتی تھیں، باری باری سے نہیں، ایک ساتھ، یہ نسرین بیگم وہ تھیں، جو ہر سال ایک درجن لحاف،

اس نے پلیٹ لاکر سامنے رکھ دی، حاجی صاحب نے بہن سے کہا،

"اب تو آؤ!"

وہ ہاتھ دھو کر آئیں، اور چٹائی کے فرش پر بھائی کے پاس بیٹھ گئیں، رخسانہ سے انھوں نے کہا،

"آجا بیٹی!"

وہ بھی آکر بیٹھ گئی، اور تینوں نے ایک ہی پلیٹ سے کھانا شروع کر دیا، کھچڑی ہی کتنی تھی، جو سب کا پیٹ بھرتا، لیکن پیٹ کو دھوکا، دینے کی اس کے علاوہ کوئی اور تدبیر نہیں تھی!

نہیں چلے گا"، یہ خاصی اچھی خوش خبری تھی، لیکن وہ پاگل خانے بھیج دیا گیا، اسی درجہ میں یہ خبر تشویش انگیز تھی، اس لیے کہ وہ جانتے تھے، دیوانوں کے ساتھ عام طور پر اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا، اور انھیں اندیشہ تھا کہ وہاں اس کے ساتھ کافی بدسلوکی ہوگی، اگر روپیہ پاس ہوتا، تو وہ انسپکٹر صاحب کی طرح، پاگل خانہ کے حاکم کو بھی ہمدرد بنا لیتے لیکن اب تو حالت کی نزاکت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، نسرین بیگم کا تقریباً تمام زیور ختم ہو چکا تھا، رخسانہ ویسے ہی زیور کم پہنتی تھی جب سبزی منڈی سے وہ قرول باغ گئی تھی، تو کوئی زیور پہن کر نہیں گئی تھی، اس کا عقیدہ تھا، سادگی سب سے بڑا زیور ہے!

ہسپتال سے جب حاجی صاحب، کیمپ واپس پہنچے، تو بہت تھکے ہوئے تھے، چہرہ اترا ہوا، لباس گرد آلود، جوتا پھٹا ہوا، کپڑے میلے، انھوں نے کبھی کریون اے، یا پانچ سو پچپن سے کم کی سگریٹ نہیں پی لیکن اب وہ بیڑی پر اتر آئے تھے، اور یہ بیڑی بھی اپنی طلب کے مطابق پینے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ایک بنڈل، کئی کئی دن چلاتے تھے، اس کے بعد، اگر انھیں کسی چیز کا شوق تھا تو وہ چائے تھی، اپنے دورِ عروج میں بہترین قسم کی چائے، وہ دن بھر میں دس بارہ بار ضرور پیتے تھے لیکن اب ایسی چائے ملتی تھی جو جوشاندہ سے مشابہ تھی، اور وہ بھی ۲۴ گھنٹے میں صرف دو بار، ایک پیالی صبح کو، ایک سہ پہر کو،

حاجی صاحب کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر رخسانہ جلدی سے چائے بنا لائی

ایک درجن رضائیاں، ایک درجن شلوکے، اور اتنی ہی تعداد میں کمبل
تقسیم کرتی تھیں، انھیں جاڑا بہت لگتا تھا، ہر سال بالکل نئی روئی
نہایت خوبصورت لحاف ان کے لیے سلتا تھا، اور یہ ٹانگیں پھیلا کر ان میں
تھیں، اور یہ زخسانہ وہ تھی، جسے موٹے موٹے لحافوں، اور روئی کی رضائی
سے نفرت تھی، یہ چاہے ایک ساتھ دس کمبل اوڑھ لے، لیکن لحاف
کی طرف پھٹکتی ہی نہیں تھی، لیکن اب پھوپھی کے ساتھ ایک ہی لحاف
مسٹی مارے پڑی رہتی تھی، اور حاجی صاحب؟ اس کڑکڑاتی سردی
صرف ایک کمبل تھا جسے اوڑھ کر وہ باہر بھی جاتے تھے، اور خیمہ میں
گٹھری بن کے پڑے بھی رہتے تھے، حاجی صاحب نماز کے بہت پابند
اس جاڑے میں بھی وہ علی الصباح اٹھتے تھے، ٹھنڈے پانی سے وضو کر
نماز پڑھتے تھے، اور خدا کا شکر ادا کرکے بقول ایک دل جلے کے "خدا
عادت بگاڑتے تھے!"

حاجی صاحب تقریباً ہر روز، نیاز کی خیر خبر لینے، ہسپتال اور پولیس
چوکی جاتے تھے، اب انسپکٹر بھی ان کا ہمدرد ہو گیا تھا، اور حوالدار
اور ان دونوں کا تجربہ سپاہی بھی،

کوئی ایک ہفتے کے بعد، انھیں نیاز کو دیکھنے کی اجازت ملی
جب وہ ہسپتال پہنچے، تو معلوم ہوا، آج ڈاکٹر نے پاگل پن کی تصدیق کر
ہے، لہٰذا اسے براہ راست، پاگل خانہ بھیج دیا گیا ہے، اور اب اس پر
نہیں چلے گا،

یہ کہتے کہتے، حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، رخسانہ نے سوچا، اب یہ چائے بھی نہیں پئیں گے۔ وہ بیڑی کا بنڈل اور چائے کی پیالی، باپ کی طرف کھسکاتی ہوئی بولی،

"چائے تو پی لیجئے، ابا، ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی!"

حاجی صاحب نے سوچا، اگر نہیں پیتا ہوں، تو لڑکی رو دے گی، مجبوراً، انھوں نے پیالی لے لی، اور ایک ایک گھونٹ کر کے پینے لگے، نسرین بیگم نے کہا،

"نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی، جب ہم گھر سے نکلے تھے، آج تک سُکھ کا ایک لمحہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا، کوئی نہ کوئی آفت، اور مصیبت پیچھے لگی رہتی ہے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"نسرین پھر بھی خدا کا شکر کرو، بہت سے ہم سے کہیں زیادہ مصیبت زدہ ہیں، مگر اُف نہیں کرتے!"

نسرین بیگم، خدا کا نام سُنکر لرز گئیں، ابھی انھیں خدا سے کئی کام لینے تھے، وہ ڈرتی تھیں، کہیں ایسا نہ ہو، میری کسی بات سے خدا خفا ہو جائے اور اس خفگی کا اثر، ریاض پر پڑے، یہ تو انھیں یقین تھا، وہ زندہ ہے، لیکن دل دھڑکتا تھا، کہیں اللہ میاں اسے چھپائے نہ رکھیں، بھائی سے خدا کا نام سنکر بولیں،

"خدا کا شکر ادا کرتے کرتے تو زبان گھسی جاتی ہے!"

نہ جانے کب کے اور کیسے دو آنے پیسے اس کے پاس پڑے تھے، ایک بنڈل بیڑی کا بھی خرید لائی، باپ کو چائے پیش کرتی ہوئی بولی،

"بھائی جان کے پاس ہو آئے آپ؟"

وہ بولے،

"ہاں ہو آیا!"

رخسانہ نے پوچھا،

"ملاقات ہوئی؟ اب کیسے ہیں؟ یہاں کب آئیں گے؟"

روہانسی آواز میں جواب دیا،

"ملاقات نہیں ہو سکی، وہ ہسپتال سے پاگل خانہ بھیج دیا گیا، وہ علاج ہوگا اس کا!"

رخسانہ سہم گئی،

"پاگل خانے؟"

"ہاں بیٹی!"

نسرین بیگم بھی بول پڑیں،

"بھیا، وہاں تو سنا ہے پاگلوں کو چار چوٹ کی مار دی جاتی ہے"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے!"

"پھر کیا ہوگا؟ کیا اس کے لیے کوئی معقول بندوبست نہیں ہو سکتا"

"کیوں نہیں ہو سکتا، لیکن مفت نہیں ہو سکتا، اور یہاں جیب خالی ہے!"

وہ دوسری طرف جاکر، اپنے شوہر سے کھسر پھسر کرنے لگیں، پھر واپس آئیں، اور رخسانہ سے کہا،

"لاؤ، کوشش کرتی ہوں!"

رخسانہ نے زیور ان کے ہاتھ میں رکھ دیا، وہ پھر اپنے شوہر کے پاس پہنچیں، اور کئی منٹ تک، راز و نیاز کرتی رہیں، پھر شوہر تو باہر چلے گئے، اور وہ آکر رخسانہ کے پاس بیٹھ گئیں، فرمایا،

"کیا کہوں، کیا زمانہ آلگا ہے، دنیا میں سونے کا بھاؤ چڑھتا جارہا ہے اور یہاں اس کے دام گھٹ رہے ہیں!"

رخسانہ "مطلب سعدی" سمجھ گئی، اس نے کہا،

"جانتی ہوں، جو دام بھی بل جائیں، میں صبر شکر کرکے لے لوں گی!"

کہنے لگیں،

"بیٹی، شکر تو ٹھیک ہے، لیکن صبر کس پر، کرو گی؟ یہ تو دہی مثل ہوئی نیکی برباد گنہ لازم، آپ نے دو اٹھیں، اسلئے پاؤں واپس کردوں گی، ہم کسی کا صبر کیوں خواہ مخواہ سمیٹیں؟"

رخسانہ اس اچانک حملہ کے لیے تیار نہیں تھی، اس سے بڑی نرمی اور ادب سے جواب دیا،

"میرا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ سمجھیں، میں نے یونہی ایک بات کہدی تھی، آپ کی تو میں احسان مند ہوں، کہ آپ نے فوراً میری درخواست قبول کرلی!"

اور یہ کہتے کہتے انھوں نے سوچا، اس شکر میں بھی شکایت کا پہلو نکل آیا، لہٰذا، پھر انھوں نے غیر محسوس طور پر اپنی صفائی دی،

"سچ تو یہ ہے خدا کا شکر نہیں ادا ہو سکتا، میں نے تو ایک بات کہی ——— تو بچتا پھر کیا ہوگا؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا،

"یہی تو سوچ رہا ہوں!"

رخسانہ کو یاد آیا، قرول باغ جب وہ گئی تھی، تو پھوپھی نے دُور مجبت میں اسے ایک سونے کی چمپاکلی، دی تھی، اس نے لینے سے انکار کیا تھا، لیکن پھوپھی کی ضد کے سامنے اسے مجبور ہو جانا پڑا تھا، وہ چمپاکلی اس کے مختصر سے سامان کے ساتھ چلی آئی تھی، باپ اور پھوپھی کو وہ باتیں کرتا چھوڑ کر، چپکے سے اٹھی، چمپاکلی نکالی، اور پاس کی ایک خاتون کے پاس گئی، جو جالندھر سے یہاں آئی تھیں، اور رخسانہ سے بہت ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کرتی تھیں، رخسانہ نے ان سے کہا،

"للہ ہمارا ایک کام کرا دیجئے!"

"ضرور کرا دوں گی، کہو بیٹی!"

"یہ میرا زیور ہے، اسے بیچنا چاہتی ہوں!"

خاتون نے فنکارانہ نظر سے چمپاکلی دیکھی، اور کہا،

"اسے بیچو گی؟"

"جی ——— لیکن ابھی!"

"کتنے میں بکا؟"

نوٹ ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے،

"اجی بکنے کو کیا پوچھتی ہو؟ اسے بکنا کہتے ہیں؟ کمبخت نے بڑی مشکل سے، چھ سو روپے دیئے، وہ بھی ہزار احسان جتا کر!"

رخسانہ پھول کی طرح کھل گئی، یہ رقم اس کی ضرورت کے لیے، بہت کافی تھی، اس نے کہا،

"بہت ہے، میرا کام چل جائے گا!"

رخسانہ روپے لے کر چلی گئی، اور وہ خاتون دل ہی دل میں کفِ افسوس ملنے لگیں، کہ جب یہ لڑکی، اس روپے میں اتنی خوش گئی ہے تو آسانی کے ساتھ اس میں سے سو اور کم کیے جا سکتے تھے، لیکن اب سانپ نکل چکا تھا، لکیر پیٹنا بیکار تھا،

رخسانہ نے جاتے ہی، رقم، باپ کے سامنے رکھ دی، اور کہا،

"ابا جان، آپ اپنا ایک لحاف بنا لیجئے، اس کمبل میں آپ کی سردی ذرا بھی نہیں جاتی، ایک جوڑ جوتہ بھی اپنے لیے لے آئیے، اور پھوپھی جان کے لیے، ایک سوئٹر لا دیجئے، ان کا سینہ بہت کمزور ہے، رات بھر کھانستی رہتی ہیں، اور باقی رقم بھائی جان پر صرف کیجئے!"

حاجی صاحب نے نوٹوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا،

"لیکن بیٹی، یہ تم لائیں کہاں سے؟

رخسانہ نے سچ بول کر، پھوپھی کو صدمہ دینا مناسب نہ سمجھا، اس نے

استنے میں خاتون کے شوہر آ گئے، انھوں نے کہا،
کوٹلے کی دلالی میں ہاتھ کالے!"
خاتون نے پوچھا،
"کیا ہوا؟"
کہنے لگے،
"میں پہنچے گیا، تو مجھ سے سوال ہوا، ثابت کرو، یہ مال چوری کا نہیں ہے
یہ ثابت کرنا تو جالندھر میں بھی مشکل تھا، لیکن یہاں تو کارے دارد!"
رخسانہ نے پوچھا،
"پھر اب کیا ہوگا؟ میرے بھائی جان کی زندگی خطرہ میں ہے!"
اور وہ رونے لگی،
خاتون کے شوہر نے کہا،
"وہ تو انھوں نے مجھے سمجھا دیا تھا، اس لیے، میں خالی ہاتھ نہیں
بیچ کر آیا ہوں، لیکن دام کم ملے ہیں!"
رخسانہ نے کہا،
"کوئی حرج نہیں، آپ کا شکریہ، آپ نے ہم بدبختوں کے لیے
تکلیف اُٹھائی!"
بڑے اخلاق سے انھوں نے کہا،
"شکریہ کی کوئی بات نہیں، میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے!"
خاتون نے دریافت کیا،

کا مستحق نہیں ہے، اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے گا، وہ قابو میں رہے گا، سختی کی جائے گی تو اس کا جنون اور بڑھے گا!"

منتظم نے حاجی صاحب کو اطمینان دلایا،

"آپ بالکل مطمئن رہیئے، کوئی سختی نہیں کی جائے گی، میں بذاتِ خود اس کی نگرانی اور رکھوالی کروں گا!"

"شکریہ!"

"چلیئے، آپ دیکھنا چاہیں، تو چل کر دیکھ لیجیئے!"

"چلیئے، بسم اللہ!"

حاجی صاحب اس کے ساتھ ساتھ گئے، نیاز ایک آہنی دروازے کی کوٹھری میں قید تھا، اور چیخ رہا تھا،

"میں پاگل نہیں ہوں! میری بیوی مجھے بلا رہی ہے، میرا بھائی مجھے اشارے کر رہا ہے، لوگو، ظلم نہ کرو، شوہر کو بیوی سے، اور بھائی کو، بھائی سے ملنے دو!"

اتنے میں اس کی نظر، حاجی صاحب پر پڑی، بڑی گرم جوشی سے گویا ہوا،

"آیئے، جناب حاجی صاحب قبلہ، تشریف لایئے، زہے قسمت کہ آپ نے اس خاکسار، ذرۂ بے مقدار، خاک پائے علمائے ذی وقار اور رہنمایان مہاجر و انصار، کے کلبۂ احزان کو مشرف و مفتخر فرمایا، غالب نے شاید آپ ہی کے لیے کہا تھا،

کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہُوا!

کہا،

"میرا ایک زیور پڑا تھا، اسے پڑوسن کے شوہر سے بکوایا ہے"
باپ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور روپے جیب میں رکھتے
ہوئے کہا،

"تجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؟"

"نہیں ابا جان!"

"تیرے لیے، ایک نیا کمبل لاؤں گا، لحاف میں تجھے نیند نہیں آتی
ہوگی، میں جانتا ہوں تیری عادت!"

رخسانہ چپ ہوگئی، اور حاجی صاحب باہر چلے گئے، سب سے پہلے
وہ پاگل خانے پہنچے، وہاں جا کر نیاز کو دیکھنے، اور اس سے ملنے کی
خواہش ظاہر کی، یہاں بھی وہی مرحلہ پیش آیا، یعنی ——————
زر برسر فولاد نہی، نرم شود! —————— جو لوگ سیدھے منہ بات
بھی نہیں کرتے تھے، وہ سراپا اخلاق و تپاک بن گئے، حاجی صاحب نے
منتظم سے کہا،

"میرے پاس اتنے روپے نہیں ہیں کہ میں نیاز کے لیے الگ
وارڈ کا انتظام کرسکوں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسے تکلیف نہ
دی جائے، وہ بڑے عالی خاندان، اور امیر گھرانے کا فرد ہے، وہ پھولوں
کی سیج پر سونے کا عادی ہے، بڑے بڑے اس سے جھک کر ملتے تھے
اب اگر اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے، تو وہ عام پاگلوں کی طرح مارپیٹ

ساتھ روا رکھ رہے ہیں!"

حاجی صاحب نے ایک سیدھی سادی بات کہدی تھی، لیکن منتظم ذہین ذکی آدمی تھا، وہ اسے ہجو ملیح، اور طنز و لطیف کے رنگ میں لے گیا، اس نے کہا،

"آپ کا مطلب؟"

حاجی صاحب نے کہا،

"مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ، جو وعدہ کیا ہے اسے اگر نبا ہیے گا تو ہمارے ٹوٹے ہوئے دل سے دعا نکلے گی"

ان الفاظ کی صداقت سے منتظم متاثر ہُوا، وہ جو چور کی ڈاڑھی میں تنکا کے مصداق ہجو ملیح اور طنز لطیف کا خیال اس کے دل میں آیا تھا، وہ دُور ہوگیا، دروازے تک اس نے حاجی صاحب کو پہنچا کر رخصت طلب کی، اور حاجی صاحب پھر اپنے کیمپ کی طرف تیز تیز بڑھے، کیونکہ مغرب کا وقت قریب آرہا تھا، اور وہ مسجد میں نماز باجماعت ناغہ نہیں کرنا چاہتے تھے!

اور چچا سعدی بھی آپ ہی کے لیے ارشاد فرما گئے ہیں، اور ایمسان کی
یہ ہے کہ خوب ارشاد فرماتے ہیں، اور ڈنکے کی چوٹ فرما
ہیں،

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے!
جو روح کو گرما دے، اور قلب کو تڑپا دے!

لیکن بڑے میاں، میں تو بھینس کے آگے بین بجا رہا ہوں، آپ ان ا
کا مطلب ہرگز نہیں سمجھ سکتے، ——— چہ داند بوزنہ لذات اد

بڑی دیر تک اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا، پھر اس نے کھنکا
حاجی صاحب کے چہرۂ انوار پہ تھوک دیا،
منتظم نے کہا،
"دیکھا آپ نے یہ حالت ہے ؟"
"جی ہاں دیکھ رہا ہوں، یہ حالت نہ ہوتی، تو یہاں کیوں آتے
حاجی صاحب چلنے لگے، تو منتظم نے ایک مرتبہ پھر انھیں اطمینا
"آپ بالکل فکر نہ کیجیے گا، بیمار کے بارے میں یہ سمجھیے گا کہ وہ گھر
اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی جائے گی میرے وعدہ پر بھ
کیجیے!"
حاجی صاحب نے کہا،
"خدا آپ کو اس مہربانی کا اجر دے گا، جو آپ میرے اور

تھے،

حاجی صاحب کیمپ کی زندگی سے تنگ آ گئے تھے، اسے وہ دریوزہ گری کی زندگی سمجھتے تھے، شہر سے بہت دور جہانگیر کے مقبرہ میں، ایک گوشہ انھوں نے اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے منتخب کیا، اور وہاں اٹھ گئے، یہاں وہاں سے زیادہ عسرت اور فاقہ کشی کا سامنا تھا لیکن اب وہ پہلے کے مقابلہ میں بہت خوش تھے، اب ان کے پاس ہوتا تھا تو کھاتے تھے، ورنہ چپ چاپ فاقے سے پڑ رہتے تھے، لیکن خوشی اس کی تھی کہ اب وہ دریوزہ گر نہیں تھے، خیرات اور بخشش پر زندگی نہیں بسر کر رہے تھے،

یہ جہانگیر کا مقبرہ تھا، جہانگیر کا، جس کی مٹھی میں سارا ہندوستان تھا۔ . . . .

. . . . آج وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے، ایک شکستہ اور کہنہ مقبرہ میں ابدی نیند سو رہا تھا اب وہ بالکل بے بس تھا نہ اس کا فرمان چل سکتا تھا نہ اس کی ہیبت کسی دل پر قائم تھی، اور یہ چند لوگ جو اس کے جوار میں آ بسے تھے، یہ بھی، اپنے شہنشاہ عالم و عالمیاں کی طرح بے بس، اور مجبور تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اس جہان گزراں سے رخصت ہو چکا تھا، اور یہ رخت سفر باندھ رہے تھے، کیا جانے کب بلاوا آ جائے اور انھیں خاموشی کے ساتھ دنیا کو داغ مفارقت دینا پڑے، وہ دنیا جو رہنے والوں کی پروا نہیں کرتی، اور جانے والوں کو یاد نہیں کرتی!

باب ۱۱

ایک اور غم !

کیمپ کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی، وبائی بیماریاں آہستہ آہستہ پاؤں جما رہی تھیں، بدنظمی، اور بے انتظامی پہلے کے مقابلہ میں، اور زیادہ بڑھ گئی تھی، مہاجرین کو کیمپ میں پیٹ بھرنے کے لیے اناج مل جاتا تھا لیکن ان کی دوسری ضروریات بھی تھیں، اور ان کے پورے ہونے کی کوئی سبیل نہیں تھی، مہاجرین کے پاس جو تھوڑی بہت پونجی تھی اور بھی ختم ہونے کے قریب تھی، اور اکثر کی تو بالکل ختم ہو چکی تھی، ان کے کیمپ سے نکلنے کا انتظام ہوتا، انھیں گھر ملتے، ان کے لیے روزگار مہیا کیا جاتا، انھیں کام شروع کرنے کے لیے روپیہ قرض دیا جاتا، تو شاید یہ زندگی نہ کھلتی، لیکن بیکاری اور بے روزگاری، اس پر طرہ، بھوک اور بیماری نے بہت سے مہاجرین کو کیمپ سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا، اور انہی لوگوں میں حاجی عبد الستار بھی

کہ ان کی زندگی سے یاس ہوجاتی تھی،
ایک روز نسرین بیگم کو شدید دورہ پڑا، وہ نیم بیہوش سی پڑی تھیں
حاجی صاحب ابھی ابھی مزدوری پر سے واپس آئے تھے، انھوں نے آتے
ہی رخسانہ سے پوچھا،
"نسرین کا کیا حال ہے؟"
رخسانہ نے کہا،
"آج تو حالت بہت خراب ہے، اگر خدانخواستہ یہی لیل ونہار ہے
تو ان کا بچنا مشکل ہے!"
حاجی صاحب نے یہ سُنا اور خاموش ہو گئے،
رخسانہ بولی،
"ذرا حکیم صاحب کے ہاں چلے جاتے!"
حاجی صاحب نے جواب دیا،
"بیٹا ایک مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ ہو آؤں، لیکن فائدہ؟"
"یہ کیوں اباجان؟"
"دوا مفت نہیں ملے گی، دوا کے ساتھ پرہیز بھی ضروری ہے، اس کا
بندوبست بھی صرف روپے سے ہوسکتا ہے۔!"
وہ دردناک آواز میں بولی،
"پھر کیا ہوگا اباجان؟ کیا پھوپھی اسی طرح ایڑیاں رگڑتی رہیں گی؟"
"میری تو عقل کام نہیں کرتی!"

پاس ہی ایک بھٹہ تھا، حاجی صاحب، ایک روپیہ چار آنے رو
پر وہاں کام کرنے لگے۔ کام یہ تھا کہ مزدوروں کی نگرانی کریں، بلکہ اگر
بہ ضرورت سے زیادہ تشدد کریں، یعنی گھنٹہ کے بجائے، سوا گھنٹہ کام
لیکن حاجی صاحب اس قماش کے آدمی نہیں تھے، جب تک
ان کے ساتھ تھا، اور وہ اپنے مختصر سے حلقہ میں بادشاہت کر رہے
تھے، جب بھی انھوں نے اپنے کسی ملازم کو نہ جھڑکا، نہ ڈانٹا، نہ جر
کیا، نہ برخاست کیا، بلکہ ان کی خطائیں معاف کیں، ان کی غیر حاضر
سے درگزر کیا، انھیں پیشگی رقمیں دیں، اور تنخواہ دیتے وقت انھیں
کاٹنا بھول گئے، ان کی مدد کی، انھیں ترقی کے راستے پر ڈالا، اور اب
کہ وہ خود بھی ایک مزدور تھے، وہ اور زیادہ مزدوروں کے ہمدرد ہو گئے
تھے، ان سے بہت زیادہ لطف اور مدارات سے پیش آتے تھے کبھی کسی
مزدور کی انھوں نے شکایت نہیں کی، سفارش کے لیے ہر وقت موجود
رہتے تھے، اور رفتہ رفتہ مالک انھیں مخدوش آدمی سمجھنے لگا تھا،

حاجی صاحب کی آمدنی بہت محدود تھی، صرف سوا روپیہ رو
اور تین آدمی، اسی مختصر سی آمدنی میں کھانا بھی، ناشتہ بھی، بیڑی بھی، کپ
کی دھلائی بھی، اور دوا علاج کا خرچ بھی، لیکن کسی نہ کسی طرح پشتم پ
کام چل رہا تھا،

نسرین بیگم جب اپنے بیٹے کے ظہور سے مایوس ہونے لگیں، تو
پڑ گئیں، وہی اختلاج کی بیماری، کبھی کبھی تو ایسی حالت نازک ہو

"ہاں بیٹی مجھے خود خیال ہے!"

بڑی دیر کے بعد، حاجی صاحب واپس آئے، رخسانہ سراپا انتظار بیٹھی ہوئی تھی، باپ کو دیکھتے ہی لپک کر سامنے آئی،

"آ گئے ابا جان؟"

"ہاں بیٹی آ گیا!"

"بھائی جان کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے، اب کبھی بیمار نہیں ہوں گے!"

رخسانہ کا دل دھک سے ہو گیا، اس نے کہا،

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"سچ کہتا ہوں بیٹی ——— نیاز کا انتقال ہو گیا، وہ ہم سب سے زیادہ خوش قسمت تھا!"

نسرین بیگم دل تھام کر بیٹھ گئیں،

"نیاز؟"

"ہاں، وہ اس دنیا سے سدھار گیا! اب کبھی ہنس ہنس کر تمہیں نہیں ستائے گا!"

وہ رونے لگیں، رخسانہ کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ٹپ ٹپ گرنے لگے، نسرین بیگم نے اپنے تئیں سنبھالتے ہوئے کہا،

"آخر وہ مرا کیسے؟ پاگل لوگ تو کئی کئی سال زندہ رہتے ہیں؟"

اور وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے، رخسانہ نے، اپنا چھوٹا سا بکس کھولا
اور اس میں سے ایک زری کا دوپٹہ نکال کر بولی،
"اسی کو بیچ آیئے!"
حاجی صاحب نے دوپٹہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا،
"اور جب زیور کی طرح کپڑے بھی ختم ہو جائیں گے تب؟ تب کیا ہوگا؟"
رخسانہ نے جواب دیا،
"خدا کوئی اور انتظام کر دے گا!"
حاجی صاحب نے پھر کوئی بات نہ کی، اور دوپٹہ لے کر باہر چلے گئے
۴۵ روپے میں بکا، سیدھے حکیم صاحب کے ہاں پہنچے، حال بیان کیا، اور
کی دوالی، اور گیارہ بجے رات کے اپنی قیام گاہ پر پہنچے، رخسانہ نے
کے سامنے، کھانا لاکر رکھا، کھانا کیا تھا، چنے کی روٹی، اور پیاز کی چٹنی
——— دوا لے کر پھوپھی کو پلائی، اور خود مصلے پر نماز پڑھنے بیٹھ
گئی،

دن اسی طرح گزر رہے تھے، ایک روز رخسانہ نے کہا،
"آج تو آپ کو چھٹی ہے، ذرا بھائی جان کی خبر لے آتے!"
حاجی صاحب نے کہا،
"میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا، جاتا ہوں!"
جب وہ جانے لگے، رخسانہ نے کہا،
"ذرا جلدی آیئے گا!"

باب ۱۲

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

زندگی کا قافلہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا،

چلا جا رہا تھا!

منزل نامعلوم ——— نہ یہ معلوم تھا کہاں ہے؟ نہ یہ معلوم تھا کس سمت ہے؟ نہ یہ علم تھا، فاصلہ کتنا ہے؟ بس، ایک ڈھرّا تھا، جس پر سب چل رہے تھے، کچھ روتے ہوئے، کچھ ہنستے ہوئے، کچھ دوڑتے ہوئے، کچھ پاؤں کے چھالوں، اور زخموں کے سبب ہانپتے ہوئے، اور کانپتے ہوئے،

اور حاجی صاحب کا قافلۂ زندگی بھی، گرم سیر تھا، لیکن چیونٹی کی سی رفتار کے ساتھ، اس قافلہ میں نہ امنگ تھی، نہ ولولہ، نہ جوش نہ حوصلہ، نہ آس، نہ پاس،

حاجی صاحب نے جواب دیا،
"ہاں کئی کئی سال زندہ رہتے ہیں، لبعض اچھے بھی ہوجاتے ہیں لیکن
وہ زندہ نہ رہ سکا، اچھا نہ ہوسکا ——— اس نے یک لخت کھانا
چھوڑ دیا، کمزور ہوتا چلا گیا، نلکی کے ذریعہ غذا پہنچانے کی کوشش کی گئی
لیکن ناکام ہوئی، اور آخر وہ اس دنیا کے جھمیلوں سے آزاد ہوگیا!"
رخسانہ نے روتے روتے دریافت کیا،
"کس وقت انتقال ہوا، بھائی جان کا!"
"تین دن ہوگئے بیٹی!"
"اور ہمیں اب اطلاع ہوئی؟ ——— ہائے انھیں کفن بھی
نہ مل سکا ہوگا، ان کی نماز ———"
حاجی صاحب نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا،
"ہمیں اطلاع کس پتے پر ملتی؟ ہم تو خانہ بدوش ہیں بیٹی ———
رہی نماز، تو نماز ہوئی ——— اس مہینہ میں، جتنا قرآن شریف
میں نے پڑھا ہے، سب نیاز کو بخش دیا، رونے سے کچھ نہیں ہوتا
تو بھی اس کے لیے دعا کر، اور قرآن بخش!

بھٹے کے ٹھیکہ دار نے بھی سوال کرلیا،

"کیوں بڑے میاں، دِلّی میں تم کیا کرتے تھے؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا،

"جو یہاں کرتا ہوں!"

"یعنی یہی مزدوری؟"

"جی اور کیا؟"

"صحیح سلامت نکل آئے میدان جنگ سے؟ کوئی جانی نقصان تو نہیں ہُوا؟"

ان سوالات سے حاجی صاحب کا کلیجہ پھٹا جارہا تھا، جی چاہتا تھا پُھوٹ پھُوٹ کر رو دیں، اور جی ہلکا کر دیں، لیکن وہ ضبط کے خو گر ہو چکے تھے، انھوں نے اپنے گریۂ بے اختیار کو روکا، اور کہا،

"خدا کا شکر ہے، میرے متعلقین میرے ساتھ ہیں اور بخیریت ہیں!"

ٹھیکہ دار صاحب، حاجی صاحب کی ایمانداری، اور کارکردگی سے بہت متاثر تھے، انھوں نے کہا،

"آپ بھی بڑے بدقسمت ہیں!"

حاجی صاحب نے پوچھا،

"بدقسمت تو ہوں، لیکن آپ نے کیسے جانا؟"

کہنے لگے،

"آپ ہم سے پہلے ملے ہوتے تو کسی چھوٹے موٹے کارخانے کو چند

آٹھ مہینے کی مدّت میں وہ ۸ سال اور بوڑھے ہو گئے تھے، کمر جھک گئی تھی، حالانکہ یہ کمر نیزے کی طرح تنی رہتی تھی، چہرہ پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں، حالانکہ یہ چہرہ بڑھاپے میں پھول کی طرح تر و تازہ، اور شاداب رہتا تھا، اب وہ ہنسنا بھول گئے تھے، حالانکہ اب سے پہلے یہی ان کا بہترین مشغلہ تھا،

ایک مزدور کی طرح وہ دن بھر محنت کرتے تھے، کڑاکے کی دھوپ ان کے سر پر گزرتی تھی، دوپہر کا کھانا، افسانہ، ماضی بن چکا تھا، اوّل تو جہانگیر کے مقبرہ تک جانا، اور واپس آنا، کچھ آسان نہیں تھا، دوسرے وہاں جاتے تو ملتا کیا؟ وہی سوکھی روٹی، اور ابالی دال یا ان دونوں سے بھی بڑھ کر، کھچڑی، جس کے جلو میں نہ گھی تھا، نہ چٹنی تھی، نہ اچار، جیب میں اگر پیسے ہوتے تو ایک آنے کے چنے لیتے اور اس پر، دو گلاس پانی پی لیتے، مقصد تو یہ تھا کہ پیٹ بھرے اور چنوں کے سہارے، پانی سے بہت آسانی کے ساتھ پیٹ بھر جاتا تھا،

حاجی صاحب کو سب سے زیادہ جس چیز سے کوفت ہوتی تھی وہ اپنے تعارف سے،

وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو یہ معلوم ہو کہ یہ سبزی منڈی کے سب سے بڑے آڑھتی تھے، اور اب دانہ دانہ کو محتاج ہیں، مزدور ساتھیوں میں سے جب کوئی ان کی دِلّی کی کہانی پوچھتا، وہ ٹال دیتے، ایک دن

"یہ ضرورت مند، اور محتاج لوگوں کا کیا قصہ لے کے بیٹھ گئے حضرت؟"

"کچھ میں نے غلط کہا؟"

"بالکل غلط، از اوّل تا آخر غلط، املا غلط، انشا غلط، سب کچھ غلط!"

اور یہ کہہ کر پھر انھوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ حاجی صاحب کو متحیر دیکھ کر وہ بولے،

"کچھ نسبت کی بھی خبر ہے؟"

"فرمائیے!"

"جو لوگ محتاج اور ضرورت مند ہیں، وہ تو زیادہ تر آپ کی طرح ٹھوکریں کھا رہے ہیں؟ الاٹمنٹ کی دولت، اور نعمت تو صرف انہی حضرات کے حصّہ میں آتی ہے، جو نہ صرف ضرورت مند ہیں نہ محتاج، کماتے پیتے آدمی ہیں، روپیہ بنک میں پٹا پڑا ہے!"

حاجی صاحب حیرت سے ان کا مُنہ دیکھ رہے تھے، اور وہ فرما رہے تھے،

"آپ مجھے اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ اجی حضرت — — روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ! ——

لیکن بندہ نواز، یہ دکانوں کا مال، یہ گھروں کا فرنیچر، یہ لہلہاتے ہوئے کھیت، یہ چلتے ہوئے کارخانے، کس کے حصّے میں آتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں ان پر اُن لوگوں کو قبضہ ہے، جو لٹ کر، پٹ کر، اپنا سب کچھ کھو کر، اور چھوڑ کر یہاں آئے ہیں؟"

دوستوں کے نام الاٹ کرا کے، آپ کو بھی اس میں شریک کر لیتا ہی
کئی دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے؟ یا کھیتی باڑی سے آپ کو د
ہوتی تو کھیت بھی مل سکتا تھا، لیکن اب موقع نکل چکا ہے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن نہ مجھے
کارخانے کی ضرورت ہے نہ کھیت کی، نہ دکان کی نہ مکان کی!"

ٹھیکہ دار صاحب کو بڑی حیرت ہوئی۔

"ارے ارے، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

حاجی صاحب نے کہا،

"ٹھیک کہتا ہوں، مزدوری کرتا ہوں، ایک وقت فاقہ کرتا ہوں
ایک وقت کھاتا ہوں، اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں، جو مزہ اس میں ہے
کسی میں نہیں! ——— پھر یہ بھی ہے کہ میں کسی کا حق کیوں ما

"اس میں حق مارنے کی کیا بات ہے بڑے میاں؟"

"کیوں نہیں ہے جناب؟ ——— مجھ سے کہیں زیادہ ضرور
اور محتاج آئے ہوئے ہیں، آخر ان کا حق چھیننے کی میں کوشش کیوں
کرتا؟"

اب ٹھیکہ دار صاحب اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے،

"بہت خوب! بہت خوب! واقعی بڑے نیک آدمی ہو بڑے میاں
قسم خدا کی، سیدھے جنت میں جاؤ گے ——— ارے

کہا،

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر دانۂ گندم کو جلا دو!

سمجھے، یہ کھیت کا دانۂ گندم جلائیں گے، تم لوگ، تو سڑی گلی روٹیاں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے چن چن کے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کے کھاتے ہو۔ ایک شعر تو اقبال نے بڑا خوفناک اور خطرناک کہا تھا! اگر وہ زندہ ہوتا تو پنجاب سیفٹی ایکٹ کے ماتحت جیل کی ہوا کھا رہا ہوتا!"

حاجی صاحب اب رنگ پر آ چکے تھے، اشتیاق کے ساتھ بولے،

"وہ شعر بھی سنا دیجئے!"

ٹھیکہ دار صاحب نے کچھ دیر تامل کیا، پھر فرمایا،

"پورا شعر تو یاد نہیں آتا، آخری مصرعہ یاد ہے، اور وہی جان سخن ہے!"

"جی فرمائیے!"

"کہتا ہے، ہماری، قوم کا مفکر اعظم، اور زعیم کبیر،

کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو!"

لیجئے، جناب کنجشک فرومایہ صاحب؟ آپ کے بازوؤں میں دم ہے شاہین سے لڑنے کا!"

اور ٹھیکہ دار صاحب، پھر ہنسنے لگے، انھوں نے ہنستے ہنستے خود ہی اپنی

"پھر؟"

"زیادہ تر اُن لوگوں نے فائدہ اُٹھایا ہے جن کے پاس پہلے
خدا کا دیا ہُوا سب کچھ موجود تھا ———— اس انقلاب کا
جانتے ہیں نتیجہ کیا ہُوا؟"

"کیا ہُوا؟ بتائیے؟"

"امیر اور زیادہ امیر ہو گئے، غریب اور زیادہ غریب ہو گئے!"

حاجی صاحب گھبرا کر بولے،

"ہُوا ہوگا صاحب ہمیں کیا؟ ہمیں تو اپنے کام سے کام!"

ٹھیکہ دار صاحب کو جلال آگیا،

"یہی تو آپ لوگوں کی کمزوری ہے!"

"وہ کیسے؟"

"وہاں سے بھی پٹ پٹا کر، لُٹ لٹا کے تشریف لائے، ادھر
بھی، بھیگی بلّی بنے رہے۔ ———— ارے میاں تم نے وہ اقب
کا شعر سُنا نہیں، جس نے پاکستان کا تخیّل مسلمان قوم کو دیا تھا!"

"کون سا شعر؟"

"وہی ———— کیا ہے؟ ———— ہاں،

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے درو دیوار ہلا دو

تم تو کاخِ امرا کا طواف کر رہے ہو، اور دیوار کیا ہلاؤ گے؟ اقبال

کیا ہے؟"

حاجی صاحب نے کہا،

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہم یہاں، کارخانے، مکان، دکان، کھیت
فیکٹریوں الاٹ کرانے کے لیے نہیں آئے ہیں، وہاں ہم کیمپ میں نہیں
کان ہی میں رہتے تھے، دکان نہ ہوتی ہم تجارت کیسے کرتے؟ خدا کا
ب کچھ تھا، لیکن وہ سب کچھ چھوڑ کر ہم یہاں صرف اس لیے آئے کہ
ہم بھلے سے مٹ جائیں، مگر پاکستان مضبوط ہو، ہم نے پاکستان کو بنتا ہوا
دیکھ لیا، یہ کافی ہے، ہمیں اپنے مرنے کا، مٹنے کا، پامال ہونے کا غم نہیں
ہے!"

حاجی صاحب ذرا رکے، ٹھیکہ دار صاحب نے فرمایا،

"کہے جائیے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"بیشک ہمیں سر چھپانے کے لیے جھونپڑا چاہیے، پیٹ بھرنے کا اناج
چاہیے، تن ڈھانکنے کو کپڑا چاہیے، ہم جانتے ہیں، ہمیں یہ معمولی چیزیں
بھی نہیں مل رہی ہیں، لیکن ہم پاکستان کی حکومت کو الزام نہیں دیتے،
لم وجود میں آتے ہی اس کے سر پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اس
کی فوج اس کے پاس نہیں، اس کا روپیہ اس کے پاس نہیں، اس کا
سامان جنگ اس کے پاس نہیں، اسے پریشان کرنے کے لیے جوناگڑھ پر
قبضہ کر لیا گیا، کشمیر پر دھاوا بول دیا گیا، حیدر، کو دبوچنے کی تیاریاں

ہنسی روک لی، اور فرمایا،

"میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ لوگ یہاں آکر، ہنگامہ یا فساد برپا کرتے، حکومت کا تختہ اُلٹتے، یا انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرتے، ان میں سے کسی کام کی ضرورت نہیں تھی، —— ضرورت اگر تھی تو صرف اس کی کہ منظم، اور پُرامن طور پر حکومت کے کانوں تک اپنی آواز پہنچا دیتے، اپنی حکومت ہو یا غیر کی، کوئی حکومت بھی ہو، وہ گراں گوش ہوتی ہے، جب تک چیخ چیخ کر اسے سنایا نہ جائے، وہ نہیں سنتی، لیکن تم لوگ، یہ چیخ نہ سکے، چپ کا روزہ رکھ کر بیٹھ رہے، بھائی میرے، ماں بھی بچّے کو دودھ اس وقت تک نہیں دیتی، جب تک وہ روئے نہ تمھاری تو وہی مثل ہوئی، جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا، رونا آیا تو گھر میں بیٹھ کر رو لیے، اور دُوسرے من و سلویٰ لے گئے۔ یہ خطا حکومت کی نہیں ہے، خُود تمھاری ہے —— مجکو تو گلہ تو ہے، اور دل سے نہیں ہے!"

حاجی صاحب، بڑے غور سے، ٹھیکہ دار صاحب کی باتیں سُن رہے تھے، آخر میں انھوں نے ایک لمبی سی، اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،

"آپ نے جو کچھ فرمایا، سب سچ ہے، لیکن ایک بات پر آپ نے غور نہیں کیا؟"

"اجی جناب میں تو نہ جانے کتنی باتوں پر غور کر چکا ہوں، اور کر رہا ہوں، ممکن ہے کوئی بات رہ گئی ہو، فرمایئے، آپ کا مطلب

ٹھیکہ دار صاحب نے بڑی حیرت اور اضطراب کے ساتھ کہا،

"بڑے میاں، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کچھ سوچا بھی آپ نے؟"

"جی خوب سوچا! ـــــ ہم اپنا حق پاکستان سے اُس وقت مانگیں گے، اور اگر وہ نہیں دے گا، تو لڑ کر لیں گے، جب وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ہمیں ہمارا حق دے سکے، ابھی اس بیچارے کے پاس ہے کیا؟ کیا ننگی نہائے گی، کیا ننگی نچوڑے گی؟ ہر بات کا ایک موقع ہوتا ہے ـــ ـــ ہر سخن وقتے، و ہر نکتہ مقامے دارد ـــ وہ وقت تو آنے دیجیے، جب، پاکستان سے ہم اپنا حق مانگ سکیں!"

جل کر ٹھیکہ دار صاحب نے کہا،

"آپ مانگ چکے، اور وہ دے چکا، یہ منہ اور مسور کی دال!"

حاجی صاحب نے ذرا بگڑے ہوئے تیور کے ساتھ کہا،

"پانچویں کالم کے لوگ چاہتے ہیں کہ ہم پاکستان کو چین سے نہ بیٹھنے دیں، اس کے راستے میں مشکلات پیدا کریں، اسے مضبوط کرنے کے بجائے، اور زیادہ کمزور کردیں! لیکن یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہم مہاجران کے آلۂ کار نہیں بن سکتے!"

ٹھیکہ دار صاحب کو تاؤ آگیا،

"ہم پانچواں کالم ہیں؟"

حاجی صاحب نے کہا،

"یہ آپ جانیں، لیکن ایسی باتیں وہی کر سکتے ہیں!"

ہو رہی ہیں، آخر وہ کیا کرے؟"

ٹھیکہ دار صاحب بہت چکرائے، انھوں نے کہا،

"یعنی آپ قانع ہیں اپنی حالت پر، اپنے حال زار پر؟"

حاجی صاحب بولے،

"اجی حضرت قانع نہیں، مطمئن، خوش، مسرور!

جب پاکستان بن رہا تھا، تو ہم نے بڑھ بڑھ کے بڑے بڑے دعوے کیے تھے، ہم پاکستان کے لیے مٹ جائیں گے، قربان ہوجائیں گے، یہ کریں گے وہ کریں گے، اور اب جب پاکستان کے لیے مٹنے، اور قربان ہونے کا وقت آیا، تو آپ چاہتے ہیں، ہم پیٹھ دکھا دیں؟ یہی تو ہمارا امتحان ہے، اسی وقت تو ہماری آزمائش ہے، اگر ہم اپنے دعوے میں سچے تھے، تو ہمیں اپنی سچائی کا، اپنے عمل سے ثبوت دینا چاہیئے، اور اگر یونہی سخن میں ہم نے جھوٹے دعوے کیے تھے، تو پھر ہم جو چاہیں کریں"

"لیکن پاکستان پر آپ کا حق ہے، اپنا حق مانگیئے!"

جی نہیں، ہمارا حق کچھ نہیں ہے، ہم پر پاکستان کا حق ہے، وہ اپنا حق ہم سے مانگ سکتا ہے، اور مانگ رہا ہے، اسے ہمارے خون کی ضرورت ہے، اور ہم اس کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہادیں گے آپ نے مہاجرین کو غلط سمجھا ہے، کیا آپ ان سے یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ بغاوت کر دیں گے، یا انقلاب کا ڈنکا بجادیں گے!"

ہوں گا!"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا،

"آپ کا خیال ہے، الاٹمنٹوں کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا، غلط تھا؟"

حاجی صاحب بولے،

"جی نہیں —— ایک ایک حرف سچ کہا —— لیکن آپ نے واقعات صحیح بتائے، اور نتائج غلط نکالے، میری آپ کی رائے میں یہیں سے اختلاف شروع ہوا، بس اور کوئی بات نہیں!"

ٹھیکہ دار صاحب نے فرمایا

"آپ تو پہیلی کہہ گئے!"

حاجی صاحب مسکرائے،

"پہیلی نہیں کہہ مکرنی کہیئے —— ان دونوں میں بظاہر بہت معمولی سا فرق ہے، لیکن درحقیقت بہت بڑا فرق ہے"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ آپ کے نزدیک اس صورت حال کی ذمہ داری حکومت پر ہے، ہے نا یہی بات؟"

"یقیناً!"

"لیکن میں سمجھتا ہوں، اس کی ساری ذمہ داری ہم پر ہے، صرف ہم پر!"

ٹھیکہ دار صاحب کا جلال بڑھ گیا،

"بڑے میاں تم تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ سٹھیا گئے ہو!"

حاجی صاحب نے فوراً جواب دیا،

"ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو ـــــ لیکن میرا سٹھیانا، اگر نقصان دہ ہے تو صرف میرے لیے، میری قوم کے لیے نہیں، میرے ملک اور حکومت کے لیے نہیں!"

ٹھیکہ دار صاحب بولے،

گویا ایک الزام میرے اوپر یہ بھی ہے کہ میں اپنے ملک اور ملت کا غدار ہوں!"

حاجی صاحب اس وقت بالکل سمجھوتہ کے موڈ میں نہیں تھے،

"معاف کیجیے گا، یہ تو وہی چور کی داڑھی میں تنکا والی بات ہوئی، میں تو کچھ نہیں کہتا، آپ خود اقرار کرتے چلے جا رہے ہیں!"

کچھ دیر تک خاموشی رہی، پھر حاجی صاحب نے کہا،

"اگر میری کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معاف کیجیے گا!"

وہ بولے،

"پہلے جوتے مار لیجیے، پھر معافی مانگ لیجیے۔ اچھا لٹکا ہے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"آپ اگر مجھے گالیاں بھی دے لیتے، تو میں اُف نہ کرتا، لیکن میں پاکستان کے خلاف کوئی بات گوارا نہیں کر سکتا، اگر سنوں گا، ضرور جواب

"دیکھیے، آپ توجہ سے نہیں سُن رہے ہیں!"

"سن رہا ہوں، کہیے!"

"ہاں تو ایک روز چند لوگ ملّا صاحب کے پاس آئے، اور کہنے لگے ملّا صاحب کچھ اور بھی سُنا آپ نے؟"

ملّا صاحب نے سراپا توجّہ بن کر، ان سے کہا،

"نہیں سُنا، کہو!"

وہ بولے،

"جونپور کا بڑا پُل خفا ہو کر بھاگا جا رہا ہے، بڑی تیزی سے؟"

وہ حیرت سے بولے

"پُل بھاگا جا رہا ہے؟"

"جی!"

ملّا صاحب کے چہرے پر، پریشانی، اور تشویش کا اظہار ہوا/ انھوں نے کہا،

"پھر تو غضب ہو جائے گا، سارا شہر ڈوب جائے گا!"

لوگوں نے کہا،

"یقیناً ڈوب جائے گا!"

ملّا صاحب نے پوچھا،

"پھر، کوئی صورت ہے؟"

جواب ملا،

"یعنی ؟"

"یعنی، مہاجر اور انصار، دونوں پر، ہم نے حکومت کو دھوکا دیا، وہ کھا گئی، حکومت کی غلطی تو صرف اتنی ہے کہ وہ دھوکا کھا گئی، لیکن ہمارا جرم تو بہت بڑا ہے، دھوکا ہم نے دیا، حکومت نے نہیں، ہم نے دھوکا کیوں دیا ؟"

"آپ ہی بتائیے، میں تو صرف سُن رہا ہوں !"

"ہم نے حکومت کو بے وقوف بنا کر دھوکا دیا، اس لیے دیا کہ ہم ناجائز فائدے اٹھانے کے خوگر ہو گئے ہیں، لہٰذا خطا ہماری ہے، حکومت کی نہیں !"

ٹھیکہ دار صاحب نے جھنجھلا کر کہا،

"حکومت کی کم از کم یہ خطا تو ہے کہ اس نے دھوکا کھایا ؟ کیوں کھایا ؟"

حاجی صاحب اس وقت بہت موج میں تھے، انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا،

"بتا دوں ؟"

"ضرور بتائیے، پوچھ ہی رہا ہوں !"

"بہتر ـــــــــ پہلے ایک قصّہ سُنیے، سنیئے گا ؟"

"سن لوں گا، فرمائیے !"

شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے استاد تھے، ملّا جیون، یہ جونپور کے رہنے والے تھے، ایک روز ان کے پاس چند لوگ آئے، ـــــ

جھوٹ نہیں بول سکتا! ——— کیا میں یہ یقین کر لیتا کہ یہ مسلمان جھوٹ بول رہے تھے، اور یہ یقین کرنے سے انکار کر دیتا کہ پل نہیں جاگ سکتا؟ بہ خدا، میں ہزار بار اس پر یقین کر سکتا ہوں کہ پل اور پہاڑ، چھلانگیں لگا سکتے ہیں، لیکن اسے ایک مرتبہ بھی باور نہیں کر سکتا، کہ مسلمان کی زبان، کذب و دروغ سے آشنا ہو سکتی ہے، ایک مسلمان کبھی جھوٹ بول سکتا ہے!"

وہ دوست خاموش ہو گئے، اور ملا صاحب اپنے کام میں لگ گئے، بالکل یہی حالت پاکستان کی حکومت کی ہے، پاکستان کی حکومت کے لیے، ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرنا، نقصانات برداشت کرنا، خسارہ برداشت کرنا، کہیں زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ یقین کیا جائے کہ مسلمان جھوٹ بول سکتے ہیں، مسلمان فریب دے سکتے ہیں، وہ بھی انفرادی طور پر نہیں، اجتماعی طور پر معمولی طور پر نہیں، منظم طور پر ——— کوئی مضائقہ نہیں، اگر مسلمانوں کی ایک جماعت، ناجائز فائدے اٹھا رہی ہے، فائدہ بہر حال مسلمان ہی کو پہنچ رہا ہے، مجھے نہ سہی، آپ کو سہی، میں اور آپ، الگ الگ کب ہیں؟ ایک ہی تو ہیں؟ آپ بھی مسلمان، اور میں بھی مسلمان!"

ٹھیکہ دار صاحب سے کچھ جواب نہ بن آیا، وہ خاموش رہے، حاجی صاحب نے پھر باتیں چھیڑ دیں، فرمایا،

"کیوں نہیں ہے؟ اگر کچھ روپیہ اسے دیا جائے، تو وہ اپنا ارادہ بدل دے گا، اور نہیں بھاگے گا!"

ملّا صاحب خوشی سے اچھل پڑے، بے ساختہ فرمایا،

"کتنا روپیہ لے لے گا بھلا؟"

"کم از کم ایک ہزار!"

آج کل کے حساب سے گویا، ایک لاکھ، ملّا صاحب فوراً اٹھ کے اندر گئے، اور ایک لاکھ کا توڑا لاکر سامنے رکھ دیا، اور کہا،

"جاؤ اسے منالو!"

لوگ پل کو منانے چلے گئے، ملّا صاحب کے ایک دوست بھی پاس بیٹھے ہوئے تھے،

انھوں نے کہا،

"آپ نے بھی سادہ لوحی کی انتہا کردی!"

ملّا صاحب نے پوچھا،

"کیوں؟"

وہ کہنے لگے،

"کہیں پل بھی بھاگ سکتا ہے؟"

ملّا صاحب نے جواب دیا،

"دنیا کے سارے پل بھاگ سکتے ہیں، سارے پہاڑ دوڑ سکتے ہیں، شجر و حجر، دیوار و در، قلابازیاں کھا سکتے ہیں، لیکن ایک مسل

زندگی ــــ بندگی ــــ بیچارگی

آدمی تو آدمی مشین بھی کام کرتے کرتے گھس جاتی ہے، صرف آدمی ہی نہیں تھکتے، مشین بھی تھکتی ہے، لیکن حاجی عبدالستار ماندگی، اور تھکن کے باوجود کام کیے جارہے تھے، نہ کرتے تو کھاتے کیا؟ کرتے کیا؟ زندہ کس طرح رہتے؟ ان کی آمدنی سوا روپیہ یومیہ سے ایک پائی بھی نہیں بڑھی، اگر کسی دن کام پر نہ جاسکے، تو یہ مزدوری بھی گئی، اور گھر میں فاقہ شروع ہوگیا، اسی لیے وہ کچھ بھی ہو مگر کام پر بلا ناغہ جاتے تھے، وہ نماز کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ لیکن اب کام، نماز سے بازی لے گیا تھا، یہ ممکن تھا، کہ کسی وقت کی نماز قضا ہوجائے، مگر یہ ناممکن تھا، کہ کسی دن وہ کام پر نہ جائیں، آدمی غیور اور خود دار تھے، وہ دیکھتے رہتے تھے، ٹھیکہ دار، اپنے کارکنوں کے ساتھ معاملات میں بہت سخت

" حکومت کی اصلاح تو ہر وقت ہو سکتی ہے، یہ انگریز کی حکومت
نہیں ہے کہ نکالے نہ نکلے، یہ تو ہماری حکومت ہے، ہماری بنائی ہوئی
ہماری قائم کی ہوئی، جب چاہیئے اسے بیک بینی دو گوش، حکومت
کے سکریٹریٹ سے رخصت کر دیجیے. لیکن جن امراض کی طرف آپ نے
اشارہ کیا، وہ اگر ہم میں جڑ پکڑ گئے، تو اس کا ساری قوم پہ اثر پڑے گا
اور انجام بہت تلخ ہو گا، لہذا حکومت کو اس کے حال پر چھوڑیے، اصلاح
کرنا ہے، تو اپنی کیجیے، اپنی سے مراد، آپ کی ذات نہیں، آپ کی قوم ہے"

…نے کہا،

"لیکن ریاض ہے کہاں؟ آتا کیوں نہیں؟"

رخسانہ نے کہا،

"آجائیں گے پھوپھی ——— میرا دل بھی کہتا ہے، وہ زندہ ہیں اور ایک دن ضرور ملیں گے!"

نسرین بیگم کی آواز گلوگیر ہوگئی، کہنے لگیں،

"لیکن دل دھوکا بھی تو دیتا ہے، اتنے دن بیت گئے، اور میں نے اب تک اپنے راج دُلارے کا مکھڑا نہیں دیکھا، کیا روتے روتے جب اندھی ہوجاؤں گی تب وہ اپنا دیدار دکھائے گا؟

مجھے یہ بھی منظور ہے لیکن وہ آئے تو!"

رخسانہ نے کہا،

"پھوپھی، آپ بھی دُعا کرتی رہتی ہیں، اور میں بھی، اور خدا دل سے نکلی ہوئی دُعا ضرور سنتا ہے، نہ گھبرایئے، بچھڑے ہوئے ایک دن ملیں گے ضرور!"

پھوپھی بڑے چاؤ سے بولیں،

"اے میں قربان، تیرے منہ میں گھی شکر، خدا وہ دن جلد لائے!"

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں، اور کوئی بارہ بجے کے قریب، دونوں سوگئیں،

رخسانہ بے خبر سورہی تھی کہ رات کے دو ڈھائی بجے، اس کی

ہے، کیا مجال ہے، جو کسی کو ایک پائی بھی دے دے، یا کسی کے ساتھ
رعایت کرے، وہ اس کا موقعہ ہی نہیں آنے دیتے تھے کہ سختیوں
درشتیوں کا ہدف بنیں، گھر کی چاہے جو کچھ حالت ہو، کرائے کے فاقے
سارے گھر پہ گذر جائیں، لیکن، انھوں نے کبھی بھول کر بھی اپنے آقا سے
پیشگی کچھ نہیں طلب کیا، اگر کسی دن، وہ غیر حاضر ہوتے تھے، تو خود ہی اپنی
غیر حاضری لکھ دیتے تھے، اور دوسرے دن شام کو جب مزدوری بٹتی تھی
تو پہلے ہی سے گھر واپس چلے جاتے تھے،

ٹھیکہ دار ان کی اداؤں سے کافی متاثر تھا، لیکن صرف تعریف
و توصیف کی حد تک، اس سے آگے کار خدا سمجھتا تھا، اور کار خداوندی
میں مداخلت اس کا شیوا نہیں تھا،

ادھر کئی روز سے نسرین بیگم کی طبیعت بہت خراب تھی، لاہور وہ
امید اور ولولہ کے ساتھ آئی تھیں، انھیں یقین تھا کہ ریاض پاکستان میں
ضرور ملے گا، لیکن یہ امید اب دن بدن یاس سے بدلتی جا رہی تھی،
ہوا یہ کہ ایک روز، وہ رخسانہ سے رات گئے تک ریاض کی باتیں
کرتی رہیں، میرا چاند ایسا ہے، میرا لال ویسا ہے، تجھے تو وہ بہت پیار
ہے، تو میری بیٹی بھی ہے، اور بہو بھی، دیکھیو، تیرا ڈولہ کس دھوم دھام
سے لاتی ہوں، بھیا بھی یاد کریں گے، ان کی دلاری بیٹی کی یوں شادی
ہوئی تھی،

لیکن یہ باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور

پر چارپائی پر دھم سے گر پڑیں، اور بیہوش ہوگئیں، حاجی صاحب زور زور سے یاسین پڑھنے لگے، رخسانہ اور زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے رب سے دعائیں مانگنے لگی ——— عدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی!

ساری رات اسی طرح بیت گئی، حاجی صاحب کے لب ہلتے رہے، رخسانہ گڑگڑا، گڑگڑا کر، خدا سے رحم کی اپیل کرتی رہی،

صبح ہوتے ہوتے، نسرین بیگم کی حالت ذرا سدھری، انھوں نے آنکھیں کھولیں، اور بڑی کمزور آواز میں کہا،

"پانی!"

اور پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر خاموش ہوگئیں، رخسانہ نے لپک کر، ٹھنڈے، پانی کا گلاس پیش کیا، جب وہ پانی پی چکیں، تو اس نے پوچھا،

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

بہت ہی آہستہ سے بولیں،

"موت کی گھڑیاں گن رہی ہوں، بیٹی!"

حاجی صاحب اب تک خاموش تھے، انھوں نے کہا،

"خدا نہ کرے! نسرین تم اس قدر ہراساں کیوں ہوتی ہو؟ خدا کا شکر ادا کرنا آسان ہے، لیکن مصیبت کی گھڑی پہ جب شکر ادا کیا جائے، وہی اصل چیز ہے!"

آنکھ کھلی، اور اس نے دیکھا کہ حاجی صاحب، نسرین بیگم کے سرہانے
سورۂ یاسین پڑھ رہے ہیں، اور ان کی حالت نازک سے نازک
ہوتی جا رہی ہے، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ چکے ہیں، زبان اینٹھی جا
ہے، اور وہ بار بار زور زور سے دل کو پکڑ پکڑ کر دبا رہی ہیں آنکھیں
پر لگی ہیں، جیسے کوئی آنے والا ہے،

رخسانہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، اور پھوپھی کے سرہانے، اور باپ
پاس کھڑی ہو گئی، اس وقت، نہ کوئی حکیم آسکتا تھا نہ ڈاکٹر، یہ حکیم
ڈاکٹر ڈبل فیس لیے بغیر رات کو گھر سے قدم نہیں نکالتے، اور یہاں
فیس کا سامان بھی نہیں تھا، لہٰذا سورۂ یاسین کی تلاوت، اور د
سوا، اور کیا کیا جا سکتا تھا؟ حاجی صاحب سورہ یاسین پڑھ ر
تھے، اور رخسانہ وضو کر کے مصلّے پر بیٹھ گئی، اور رو رو کے اپنے
سے دعا مانگنے لگی، کہ یا اللہ، میری پھوپھی پر رحم کردے، وہ اچھی
جائیں،

دفعتہً، نسرین بیگم، دل پہ ہاتھ رکھ کر زور سے اچھلیں، اور ان
منہ سے نکلا،

"ارے بچاؤ، میرے بچے کو بچاؤ، اسے مارے ڈالتے ہیں، ا
اس کا گلا گھونٹ رہے ہیں، ارے اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے، پاؤ
کاٹ دیئے، اب گردن پر چھری پھیر رہے ہیں، وہ مر جائے گا
بچاؤ ———— بچاؤ ———— اور یہ کہتے

"ایک بہت ضروری کام ہے؟"

"ہاں ہاں فرمائیے، فرمائیے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"مجھے ۲۵۔۳۰ روپے کی سخت ضرورت ہے!"

وہ اچھل پڑے،

"ایک دم سے ۲۵۔۳۰؟"

"جی ہاں، کم سے کم اتنے!"

"آخر فرمائیے تو کیوں؟"

حاجی صاحب نے مختصر الفاظ میں بہن کی خوفناک، اور خطرناک حالت کی کہانی سنائی، اور یہ کہانی سناتے سناتے، ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں کبھی کبھی پتھر میں بھی جونک لگ جاتی ہے، اس وقت بھی یہی ہوا، پتھر میں جونک لگ گئی، ٹھیکہ دار صاحب نے اپنی وزنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ حاجی صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیئے، یہ بالکل خلاف توقع واقعہ تھا، انھوں نے مانگے تھے، ۲۵۔۳۰ اور مل گئے پچاس، انھوں نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا،

"یہ تو پچاس ہیں!"

بڑی شان استغنا سے بولے،

"ہاں، میں نے پچاس دیئے ہیں"

حاجی صاحب نے شکر گزار آنکھوں سے انھیں دیکھا، اور رقم جیب

پھر سب خاموش ہوگئے، اور اب حاجی صاحب کو فکر ہوئی کہ کسی
کو دکھائیں ورنہ اگر یونہی پڑی رہیں تو ان کا اللہ بیلی ہوجائے گا،

گھر سے باہر نکلے، لیکن اب جائیں کہاں؟ ایک سے ایک
شفاء الملک، اور، ایم ڈی، موجود تھے، لیکن وہ ایک غریب
تک کیوں آتے؟ دواخانوں، اور عطاروں کی بھی کمی نہیں تھی، لیکن
وہ ایک بے وطن تباہ حال کو مفت یا قرض دوا کیوں دیتے؟

اب تک حاجی صاحب نے ہر مصیبت بڑے ٹھاٹھ سے برداشت
تھی، یعنی کسی کے سامنے اپنی خودداری اور آن کو انھوں نے مجروح
ہونے دیا تھا، لیکن ساتھ کی کھیلی ہوئی، اور ایک ہی ماں کی کوکھ
لینے والی بہن کو وہ مرتا بھی تو نہیں دیکھ سکتے تھے، چنانچہ آن اور خودداری
کو بالائے طاق رکھ کر وہ ٹھیکہ دار کے گھر پہنچے، وہ ابھی ابھی ناشتہ کر کے
حُقّے پر بیٹھا تھا، خمیرہ کی مہک سے سارا کمرہ معطر ہو رہا تھا، اس نے
صاحب کو دیکھتے ہی کہا،

"ارے آپ کہاں؟ آیئے!"

حاجی صاحب پاس آکر بیٹھ گئے، انھوں نے کہا،

"آپ ہی کے پاس آیا تھا"

ٹھیکہ دار نے اخلاق سے جواب دیا،

"خیریت؟ فرمایئے!"

حاجی صاحب نے اپنے حواس مجتمع کر کے کہا،

"میں نسخہ لکھے دیتا ہوں، آپ استعمال کرائیے، لیکن، ان کا دل بہت کمزور ہو چکا ہے، اگر احتیاط نہ کی گئی، تو کسی وقت بھی ان کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے، کم از کم دو مہینہ تک ان کا علاج باقاعدگی کے ساتھ ہونا چاہیئے!"

حاجی صاحب، حکیم صاحب کے ساتھ پھر مطب گئے، انھوں نے ایک ہفتہ کی دوا دی، اور بارہ روپے قیمت وصول کی، حاجی صاحب مطب سے گھر تک پیدل آئے، ترکیب استعمال رخسانہ کو سمجھائی، اور بغیر ناشتہ کیے، یا کھانا کھائے، بھٹہ کی طرف چل دیئے، آخر انھیں ڈیوٹی پر بھی تو جانا تھا،

دن بھر وہ فاقہ کے عالم میں کام کرتے رہے، ٹھیکہ دار نے جو رقم انھیں بہن کے علاج کے لیے دی تھی، اس میں سے ایک پیسہ بھی وہ اپنے اوپر صرف کرنا نہیں چاہتے تھے، شام کو تھکے ہارے گھر پہنچے، نسرین بیگم کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی، لیکن کمزور بہت ہو گئی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، مہینوں کی بیمار ہیں، ان کی خیریت دریافت کر کے، اور دو چار تسلی کے کلمے کہہ کر وہ دوسری طرف آ کر بیٹھ گئے، رخسانہ بھی آ گئی، حاجی صاحب نے پوچھا،

"بیٹی تو نے کھانا کھایا؟"

وہ بولی،

"کھانے کا ہوش کسے تھا؟ آپ کے جانے کے بعد، تو پھوپھی کی

میں رکھ لی، پھر انھوں نے ٹھیکہ دار سے کہا،

"جہاں آپ نے اتنا بڑا احسان کیا ہے، ایک اور سہی!"

بولے،

"فرمائیے!"

یہ رقم میں ادا تو ضرور کروں گا، اگر زندہ رہا، لیکن میں چاہتا ہوں میری مزدوری میں نہ کٹے، اسے قرض حسنہ سمجھئے۔ حالات اگر ٹھیک ہوئے تو ادا کر دوں گا، ورنہ معاف کر دیجیے گا!"

یہ کہتے کہتے حاجی صاحب کی آواز پھر بھر آئی، ٹھیکہ دار نے کہا،

"یہ رقم میں نے آپ کو اپنی طرف سے بطور نذر دی ہے، اس کی واپسی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اسے آپ اپنی بہن کے دوا علاج پر صرف کیجئے ——— اور ہاں، آج سے آپ اپنی مزدوری سوا روپیہ یومیہ کے بجائے دو روپیہ کر لیجیے، آخر دوا علاج، پرہیز پر کچھ نہ کچھ خرچ ہوگا!"

حاجی صاحب نے، بڑے غور سے ٹھیکہ دار کو دیکھا، اس کی سب ماہیت پر ان کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی، یہ تو وہی بات ہوئی ——— پاسباں مل گئے، کعبہ کو صنم خانے سے!"

ٹھیکہ دار کے ہاں سے نکل کر، حاجی صاحب، حکیم ممتاز علی کے مطب میں پہنچے، انھیں فیس دے کر، اپنے گھر لائے، اور نسرین کا معائنہ کرایا۔ حکیم صاحب نے بڑے انہماک سے مریضہ کو دیکھا، اور باہر آ کر

اس کام سے فارغ ہو کر، حاجی صاحب نے پوچھا،

"اور نسرین؟"

رخسانہ نے جواب دیا،

"انھیں بھوک نہیں ہے، وہ نہیں کھائیں گی! میں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ انکار ہی کرتی رہیں"

رات کو عشا کی نماز پڑھنے، حاجی صاحب پاس کی مسجد میں گئے، یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس میں آس پاس کے لوگ آجاتے تھے، دو ڈھائی صفیں ہو جاتی تھیں، حاجی صاحب عشا اور فجر کی نماز پابندی سے یہیں پڑھتے تھے، اس حلقہ میں بہت سے مہاجر آباد تھے، کچھ جہانگیر کے مقبرے میں رہتے تھے، کچھ نے جھونپڑیاں ڈال لی تھیں، نماز کے بعد جب حاجی صاحب واپس آرہے تھے، ایک مہاجر نے ان سے کہا،

"حاجی صاحب کچھ کہنا تھا آپ سے!"

وہ رک گئے،

"کہو!"

وہ بولا،

"دو روپے ہوں تو دے دیجیے!"

حاجی صاحب نے بیمار بہن کے علاج کی رقم میں سے چپ چاپ دو روپے نکالے، اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیے، وہ اس آدمی کو والٹن کیمپ سے جانتے تھے، بڑا اسلجھا ہوا، اور معقول آدمی تھا، کبھی متعلقین

حالت اور خراب ہو گئی تھی، اسی لیے کچھ پکا بھی نہ سکی، آپ نے دن کو بھی نہیں کھایا ہے، اب جاتی ہوں، آپ کے لیے دو روٹی ڈالے دیتی ہوں!"

حاجی صاحب خفا ہو گئے،

"میں گیا جہنم میں، تم سے فاقہ کرنے کو کس نے کہا تھا؟ کیوں مجھے قبل از وقت مارنا چاہتی ہو بیٹی؟"

رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، حاجی صاحب نے کہا،

"بیٹی، تجھے میرے لیے زندہ رہنا چاہیئے!"

پھر بولے،

"تو بیٹھ، میں ابھی آیا!"

آج کی مزدوری جیب میں تھی، باہر جا کر، ایک تندور سے انھوں نے تین روٹیاں خریدیں، سامنے کباب والا گلے سڑے گوشت کے کباب بیچ رہا تھا، اس سے کباب لیے، اور گھر پہنچے، رخسانہ سے کہنے لگے

"لے کھالے بیٹی!"

بھوک سے وہ بھی نڈھال ہوئی جا رہی تھی، اب تکلف نہ کر سکی، چپ چاپ آ کر بیٹھ گئی، کہنے لگی،

"آئیے!"

وہ بھی ہاتھ دھو کر اس کے پاس بیٹھ گئے، اور باپ بیٹی یہ روکھا سوکھا کھانا اس طرح کھانے لگے، جیسے یہ کوئی بہت بڑی نعمت ہے

"یہ بھی رکھ لو جب ہوں تو دے دینا، میں تقاضہ نہیں کروں گا!"

وہ بولا،

"نہیں، یہی آپ کا بہت بڑا احسان ہے"

حاجی صاحب نے روپے اس کی جیب میں ڈال دیئے، وہ کہنے لگا،

"جی چاہتا ہے، سب کا گلا گھونٹ دوں، اور دریا میں چھلانگ لگا دوں!"

"یہ کیوں بھئی؟"

"کیا فائدہ ایسی زندگی سے؟ لعنت ہے ایسی زندگی پر، اس سے موت ہزار درجہ اچھی؟"

حاجی صاحب نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا، اور کہا،

"بس اتنے ہی میں بلبلا گئے؟ ——— ارے میاں ذرا ان لوگوں کو یاد کرو، جن کے بیوی بچے بھی لیے گئے، جن کا سب کچھ لُوٹ لیا گیا جنھیں بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا، تم ان لوگوں سے تو اچھے ہو، اطمینان سے پاکستان پہنچ گئے، بال بچے ساتھ ہیں، رہی بیکاری، سو جس خدا نے برف کے کارخانے میں نوکری دلائی تھی، وہ کیا کہیں اور نہیں دلا سکتا! ——— جاؤ، خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہئے"

وہ بولا،

"مجھے خدا سے شکوہ نہیں، پاکستان سے شکوہ ہے!"

"یہ کیوں میاں؟"

ساتھ تھے سب کا تنہا کفیل یہی تھا، ایک برف کے کارخانے میں ایون سو ماہوار پر ملازم تھا، یہ کارخانہ کچھ مہاجرین کو الاٹ ہوا تھا، چار مہاجر اسے چلا رہے تھے، دو مقامی مہاجر تھے، دو بیرونی، خاصی آمدنی تھی لیکن مہاجر ملازموں کے ساتھ برتاؤ اچھا نہیں تھا، کارخانہ کے منیجر صاحب خاص الخاص مہاجر تھے، یعنی، یہ دلّی سے بہت کچھ کھو کر آئے تھے، آدمی حکام رس تھے اس لیے آسانی سے اس کارخانہ کے حصّہ دار بن گئے، لیکن مہاجر ہونے کے باوجود یہ مہاجر ملازموں کے ساتھ بدسلوکی، اور بدزبانی کا برتاؤ کرتے تھے، یہ آدمی جو اس وقت حاجی صاحب سے دو روپے قرض لے رہا تھا، انہی کے غصّہ کا ہدف بنا، اور ملازمت سے برطرف کر دیا گیا کئی دن سے بیکار بیٹھا تھا، کل رات سے گھر بھر فاقہ سے تھا اس وقت حاجی صاحب نظر آئے، تو ہمّت کر کے دو روپے قرض لیے۔

قرض دینے کے بعد، حاجی صاحب نے پوچھا،

"کہو کیا حال ہے؟"

وہ بولا،

"ٹھیک ہے، خدا کا شکر ہے!"

"کام چل رہا ہے؟"

"نوکری سے تو جواب مل گیا، کئی دن ہوئے!"

حاجی صاحب سمجھ گئے، اب اس کے اور اس کے گھر کے حالات کیا ہوں گے؟ انھوں نے تین روپے اور جیب سے نکالے، اور کہا،

وہ رونے لگا،

"پھر کیا کروں؟"

حاجی صاحب نے اس کی پیٹھ تھپکی اور کہا،

"تم مرد ہو، اپنے اندر مردوں کی شان پیدا کرو، مصائب کا بہادری سے مقابلہ کرو، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مر جاؤ گے، لیکن یاد رکھو مردوں کی طرح مرنا بھی بہت بڑی بات ہے ـــــــــ حکومت پر وزیروں پر، لیڈروں پر نکتہ چینی کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا"

وہ جھلا کر بولا،

"کیوں نہیں ہوگا؟ ہم تختہ اُلٹ دیں گے اس کا!"

حاجی صاحب مسکرائے،

"پھر وہی باتیں ـــــــــ مان لیا تختہ اُلٹ دو گے، لیکن یہ بتاؤ، ان کی جگہ پر لاؤ گے کسے؟ ہے کوئی تمھاری نظر میں؟ یہ لاکھ بُرے سہی، مانتا ہوں ان میں کمزوریاں ہیں، لیکن جو لوگ ان کی جگہ لینے کے لیے پر پھڑپھڑا رہے ہیں، وہ اگر آ گئے تو رو تے نہیں بنے گی، میاں ذوالفقار!"

ذوالفقار نے کہا،

"نئے لوگ زمانہ پیدا کرلے گا، ہم کیوں سوچیں!"

"ٹھیک کہتے ہو، لیکن زمانہ نے انہی لوگوں کو پیدا کیا ہے، یہ سب

"ہم پاکستان کے لیے اس حال کو پہنچے اور ہمارے لیڈر اور وزیر موٹروں میں دندناتے ہیں، طیاروں میں اُڑتے ہیں، بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں، زندگی کے مزے اڑاتے ہیں، اور ہم یوں ایڑیاں رگڑتے ہیں!"

حاجی صاحب نے کہا،

"اب تم بہک چلے!"

"یہ کیوں؟"

"اور کیا؟ ——— تم لیڈر نہیں ہو، عام آدمی ہو، تم یہاں سیاسیات میں حصّہ لینے نہیں آئے ہو، چین کی زندگی بسر کرنے آئے ہو، کون کیا کرتا ہے، اس سے تمھیں کیا بحث؟ تم تو اپنی خبر لو!"

کیسے مطلب نہیں؟ ہمارے خون پر، لاشوں پر ان کی لیڈری کی بنیاد رکھی گئی ہے، ہم اس حالت میں، اور یہ اس مزے میں، اللہ جانتا ہے، بعض وقت جی چاہتا ہے کہ کہیں سے بم لاؤں، اور سب کو ختم کر دوں!"

حاجی صاحب کو تاؤ آگیا،

"میاں اتنے بڑے بمباز تھے، تو دلّی میں تمھارے ہاتھ کیوں شل ہو گئے تھے؟ دشمنوں سے بم کھاؤ گے؟ اپنوں پہ بم مارو گے؟ یہ ہے تمھاری مردمی؟ یہ ہے تمھاری بہادری؟ ایں؟"

وہ خاموش رہی، حاجی صاحب نے کہا،

"تم سو رہو، میں جاگتا ہوں"

نسرین نے کہا،

"آپ کو صبح اُٹھ کر، کام پر جانا ہے، مجھے کون سا کام ہے!"

بڑی دیر تک باپ بیٹی میں بحث ہوتی رہی، اور آخر دونوں سو گئے،

اگرچہ بڑی تن دہی سے حاجی صاحب، نسرین کا علاج کر رہے تھے، لیکن ان کی حالت دن بدن گرتی چلی جا رہی تھی، خود حکیم صاحب کو حیرت تھی، "اتنی طاقت کی دوائیں دیتا ہوں، مگر وہ اثر نہیں کرتیں، معلوم ہوتا ہے، ان کا صدمہ قائم ہے، اور ہر وقت وہی ان کے دل اور دماغ پر مسلط رہتا ہے، اور اگر ان کی یہی حالت رہی، تو ان کا زندہ رہنا بہت مشکل ہے، میں کیا کوئی بھی انھیں چنگا نہیں کر سکتا" ———

حاجی صاحب نے کہا،

"یہ تو خدا کا کام ہے کہ کسے اچھا کرے کسے نہ کرے، ہمارا کام تو صرف یہ ہے کہ اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں!"

حکیم صاحب نے کہا،

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں، لیکن، کسی طرح اور کسی قیمت پر بھی انکی طبیعت بہلانے کی کوشش کیجیے"

حاجی صاحب نے جواب دیا،

"کرتا ہوں، لیکن وہ ہر پھر کے، اپنے غم کو پکڑ لیتی ہیں، اکلوتا،

لوگ نئے ہیں، پُرانے نہیں، پرانے جو زندہ ہیں، وہ مُردوں سے بدتر ہیں! ——

ذوالفقار نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا،

"یہ لوگ حکومت نہیں چلا سکتے!"

حاجی صاحب بولے،

"جو لوگ بھی حکومت چلائیں گے، ان کے خلاف کچھ نہ کچھ لوگ موجود رہیں گے، کوئی حکومت بھی اپنی رعایا کے ہر فرد کو خوش نہیں رکھ سکتی اور ہماری حکومت پر تو وہ مصیبت پڑی ہے، کہ کوئی اور حکومت ہوتی، تو اس کی کمر ٹوٹ جاتی، اپنے ساتھ سارے ملک کو لے ڈوبتی ہماری حکومت تو بہر حال کچھ نہ کچھ کر رہی ہے، اپنی مصیبت کے ساتھ دوسروں کی مشکلات کا بھی تو احساس کرو، میرے بھائی!"

کافی رات گزر چکی تھی حاجی صاحب مسجد سے لوٹ کر گھر آئے اُس رات بیگم غنودگی کے عالم میں تھیں، اور رخسانہ بدستور ان کے سرہانے بیٹھی جاگ رہی تھی،

حاجی صاحب نے کہا،

"بیٹی سوئیں نہیں!"

"نیند نہیں آتی ابا جان!"

بڑی شفقت سے بولے،

"خود بھی بیمار پڑنا چاہتی ہو کیا؟"

"بیٹی ——— جو اس دُنیا میں آیا ہے، اسے ایک دن یہاں سے جانا ہے، چاہے وہ غریب ہو یا امیر، بادشاہ ہو یا فقیر ——— ——— موت سے کس کو رستگاری ہے؟ ——— آج وہ کل ہماری باری ہے ——— ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہماری گردن خدا کی مرضی کے آگے جھکی ہوئی ہے، وہ جو کچھ کرے گا، اچھا کرے گا، ہماری تاب نہیں کہ ہم اس پہ اعتراض کریں۔"

حاجی صاحب نے جیب سے حکیم صاحب کی دی ہوئی ڈبیہ نکالی، اور ایک رتی دوا، ٹھنڈے پانی کے ساتھ بہن کو پلائی،

دوا پی کر، نسرین کی آنکھیں کھل گئیں، صاف معلوم ہو رہا تھا، اب ان میں پہلے کے مقابلہ میں توانائی آ گئی ہے، انھوں نے آنکھیں کھولیں، ایک نظر سارے گھر پہ ڈالی، پھر بھائی کو دیکھا، پھر بھتیجی کو، کچھ دیر تک وہ اسی طرح دیکھتی رہیں، پھر انھوں نے رخسانہ سے کہا،

"بیٹی اِدھر آ!"

وہ سامنے آ کر کھڑی ہو گئی، انھوں نے کہا،

"بیٹھ جاؤ"

وہ پائنتی بیٹھ گئی، کہنے لگیں،

"کوئی اونچی چیز میری پیٹھ کی طرف رکھ دے، لیٹے لیٹے تھک گئی، ذرا بیٹھوں گی!"

اور جوان بیٹیا، کوئی سمجھائے بھی تو کس طرح سمجھائے، اور سمجھا
کیا سمجھائے؟ ——— دل صاحب اولاد سے انصاف
ہے!"

حکیم صاحب نے کہا،

"میرے پاس ایک آخری چیز ہے، وہ دیتا ہوں، اگر جیت
سے سنبھل گئی تو سنبھل گئی، ورنہ میں تو ہار مان لوں گا!"

حکیم صاحب گھر کے اندر سے ایک ڈبہ لائے چھوٹی سی ڈب
اس میں خمیرہ کی طرح کی کوئی چیز تھی، کہنے لگے۔

"ایک ایک رتی، دن میں ۳ مرتبہ دیجیے"

حاجی صاحب، دوا لے کر گھر آئے، نسرین کا وہی حال تھا
تھا، اب ان کی بیماری کو، دو ہفتے کی مدت گزر چکی تھی، لیکن ا
حالات رو بہ اعتدال نہیں آئے تھے، ایک روز ان کی نازک
دیکھ کر رخسانہ رو دی، اس نے باپ سے کہا،

"پھوپھی کی حالت دیکھی نہیں جاتی!"

اور یہ کہتے کہتے، وہ ابل پڑی، اسے روتا دیکھ کر حاجی
کی خشک آنکھوں میں بھی آنسوؤں کا سمندر لہریں لینے لگا،
کہا،

"اگر خدا نخواستہ انھیں کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا ابا!"

حاجی صاحب نے کہا،

"کہو!"

وہ بولیں،

"صرف ایک بات!"

"ایک نہیں، جتنی باتیں چاہو کہو ——— لیکن جلدی سے کہہ ڈالو، ورنہ تکان بڑھتی جائے گی!"

وہ کہنے لگیں،

"اگر ریاض مل جائے ———"

"تم اطمینان رکھو، وہ ضرور ملے گا!"

"ہاں تو اگر ریاض مل جائے، تو اس کی شادی رخسانہ سے کر دینا!"

رخسانہ روتی ہوئی اس جگہ سے ٹل گئی، اور نسرین نے بھائی سے کہا،

"یہ میری تمنا ہے، وعدہ کرو، پورا کرو گے اسے!"

سینہ پر ہاتھ مار کر بھائی نے کہا،

"ضرور ——— ضرور پورا کروں گا، اری پگلی، رخسانہ، ریاض کے سوا ہو کس کی سکتی ہے؟ وہ میرا بیٹا ہے، کیا تو سمجھتی ہے، میں اس سے محبت نہیں کرتا؟"

"نہیں، میں یہ نہیں سمجھتی، لیکن بھابی ریاض سے خفا تھیں، وہ اپنے خاندان میں رخسانہ کو بیاہنا چاہتی تھیں، میری ان کی کبھی نہیں بنی، لیکن رخسانہ کو میں شروع سے چاہتی ہوں، شروع سے میری آرزو ہے کہ وہ میری بہو بنے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"تھک جاؤگی، بیٹی رہو!"

وہ بچّوں کی طرح مچل گئیں،

"نہیں میں بیٹھوں گی!"

رخسانہ انھیں اس رنگ میں دیکھ کر بہت خوش ہوئی، سمجھی، اب ان کی بیماری رخصت ہو رہی ہے؟ اور صحّت گود پھیلائے ان کی دا بڑھ رہی ہے، اس نے جلدی سے لحاف کا گاؤ تکیہ سا بنایا ا لاکر، نسرین بیگم کے پیچھے رکھ دیا، پھر سہارا دے کر بٹھا دیا،

جب وہ بیٹھ گئیں، تو انھوں نے کہا،

"میں کلّی کردوں گی!"

رخسانہ نے کلّی کرائی، انھوں نے بھائی سے کہا،

"میری وصیّت سن لو بھیّا!"

وصیّت کا نام سنکر، بھائی کے بھی اوسان خطا ہو گئے ا کے پاؤں تلے سے بھی زمین نکل گئی، حاجی صاحب نے کہا،

"نسرین، تم اچھی ہوجاؤگی، ایسی باتیں نہ کرو!"

وہ بولیں،

"میں اب اچھی نہیں ہوسکتی، میرا بلاوا آگیا، میں اب گھڑی دو گھڑی مہمان ہوں، میری بات سُن لو!"

حاجی صاحب نے کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر کہا،

وہ خاموش تھی، ہر طرح خاموش تھی، جیسے وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے یہ کیا ہوا کیا موت کا پنجہ پھوپھی تک بھی پہنچ سکتا ہے؟ کیا وہ مر گئیں؟ کیا انھیں بھی موت آسکتی ہے؟"

حاجی صاحب نے رخسانہ کا یہ رنگ دیکھا، اور کانپ گئے، وہ چاہتے تھے، رخسانہ روئے، چیخے، تاکہ اس کا دل ہلکا ہو، اس کا غم کم ہو، لیکن یہ خاموشی خطرناک تھی، وہ ڈرے کہیں ایسا نہ ہو یہ بھی ہاتھ سے نکل جائے، انھوں نے آکر رخسانہ کو جھنجوڑا، اور کہا،

"رخسانہ!"

وہ خاموش رہی، انھوں نے پھر کہا،

"رخسانہ بیٹی!"

مگر رخسانہ بیٹی حیران حیران باپ کو دیکھتی رہی اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا، حاجی صاحب نے کہا،

"بیٹی، نسرین مرگئی!"

وہ اب بھی چپ تھی، وہ بولے،

"رخسانہ تیری پھوپھی، تجھے چھوڑ کر اس دُنیا سے چلی گئی!"

رخسانہ کی حیرت اور خاموشی بدستور قائم تھی، وہ زور زور سے اسے کلیجے سے لگا کے رونے لگے، وہ کلیجہ سے تو لگ گئی، مگر اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا، انھوں نے کہا،

"تجھے کیا ہوگیا ہے، بیٹی؟ تیری پیاری پھوپھی مرگئی، اور تو اتنی سنگدل

حاجی صاحب نے کہا،

"میں ان کی زندگی میں ہی، یہ فیصلہ کر چکا تھا، کہ رخسانہ گھر ہی
رہے گی، فکر نہ کرو، ـــــــ انشااللہ تم اچھی ہو جاؤ گی، ریاض
سہرا تم خود باندھو گی، رخسانہ کو تم خود ڈولے سے اتارو گی!"

یہ کہہ کر، حاجی صاحب نے نظر اٹھائی، تو نسرین بیگم کا منکا ڈھ
چکا تھا، وہ گردن ڈال چکی تھیں، اس دنیا سے، اور اس کے بکھیڑوں
ہمیشہ کے لیے آزاد ہو چکی تھی، یہ حال دیکھ کر حاجی صاحب بن
قریب آئے، نبض دیکھی تو وہ غائب تھی، بڑی زور سے چیخے،

"نسرین!"

نسرین کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں، لیکن رخسانہ سہمی ہوئی آئی
اس نے کہا،

"کیا بات ہے ابا!"

وہ بولے،

"نسرین!"

اور بے تحاشہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے
وہ برابر ضبط کرتے چلے آئے تھے، لیکن اب ان کے ضبط کا دامن
چکا تھا، اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے، رخسانہ پر
حادثہ کا اتنا گہرا اثر پڑا تھا کہ وہ رو بھی نہ سکی، چیخ بھی نہ سکی جب
وہ حیرت سے ٹکر ٹکر کبھی باپ کو دیکھتی تھی، کبھی بھی کی لاش

"کہیئے، کیسے آنا ہُوا؟"

"آج آخری بار آیا ہوں!"

"کیوں؟"

"میری بہن کا انتقال ہوگیا، اب اسے آخری منزل تک پہنچانے کے لیے آپ کی آخری مدد کی ضرورت ہے؟"

نسرین کے انتقال کی خبر سنکر وہ ہکّا بکّا رہ گیا، اس نے کہا،

"واقعی؟"

حاجی صاحب نے کہا،

"جی ہاں! اب اس کے لیے کفن کی ضرورت ہے ——— کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

اس نے کہا،

"ضرور!"

اور اس نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا، اور پھر دس دس کے پانچ نوٹ حاجی صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیئے، وہ سیدھے بزّاز کے ہاں گئے کفن کا کپڑا خریدا اور پھر اپنے گھر پہنچ گئے،

وہاں، نسرین بیگم کو غسل دیا جارہا تھا، پھر کفن بھی دے دیا گیا اور پھر ایک چارپائی پر ان کی لاش رکھی گئی، حاجی صاحب نے سب سے پہلے کاندھا دیا، پھر اور لوگ ٹوٹ پڑے، رخسانہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار جاری تھا، وہ رو رہی تھی، جتنی جتنی اسے تسلی دی

یہ گو... ہے کہ روتی بھی نہیں، رو، او ظالم لڑکی، رو ——
اب تجھے کبھی نہیں ملے گی،
اور رخسانہ آگے بڑھی، باپ کے کلیجہ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی،
جتنا جتنا وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی، حاجی صاحب اس کی طرف
سے مطمئن ہوتے جا رہے تھے، ان کا خدشہ کم ہوتا جا رہا تھا،
رونے دھونے کی آواز سنکر آس پاس کے لوگ اور ان کی
عورتیں جمع ہوگئیں، کوئی رخسانہ کو تسلی دینے لگی، کوئی نسرین بیگم کو آخری
منزل تک پہنچانے کا انتظام کرنے لگی،
حاجی صاحب باہر کھڑے تھے، یہاں ان کے بعض پڑوسی موجود تھے
ایک نے کہا،
"حاجی صاحب کفن لائیے!"
حاجی صاحب نے کہا،
"جاتا ہوں!"
اور وہ کفن لینے کے لیے چلے گئے، لیکن جیب خالی تھی، کس کے
پر جائیں؟ کون انھیں کفن ادھار دے دے گا؟ ملّا کی دوڑ مسجد
وہ پھر سیدھے ٹھیکہ دار کے گھر پہنچے، وہ آج ان سے تپاک سے ملا
دل میں خیال کیا، انھوں نے تو گھر دیکھ لیا ہے، ذرا بے رخی سے
اس نے کہا،

باب ۱۴

گردشِ مدام

یہ پے بہ پے صدمے ایسے نہیں تھے، جو حاجی صاحب کے بڑھاپے کو موت سے قریب نہ کر دیتے، سبزی منڈی کے لٹنے کے وقت سے لے کر اب تک ایک دن بھی، ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ملا تھا، جو اطمینان و عافیت کا ہوتا ہر روز کوئی نہ کوئی تازہ مصیبت ان کے سر پہ کھڑی رہتی تھی، وہ ہمت والے آدمی تھے، اور ڈٹ کر مصیبت کا مقابلہ کرتے تھے لیکن آخر آدمی ہی تھے، وہی آدمی جس کے بارے میں غالب نے کہا ہے ——— کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دِل ———

——— انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں ———

اس آخری غم نے ان کی کمر ہمت توڑ دی، جیسے ایک کمزور سی شاخ پر پہاڑ کی سل آن کر گر پڑے،

جاتی اتنی ہی اس کی اشک ریزی بڑھتی جاتی تھی، اور قبرستان میں جب حاجی صاحب نے بہن کو قبر میں اتارا، تو ان کے پاؤں کانپنے لگے وہ تیورا کے گرے اور بیہوش ہو گئے، جس چارپائی پر نسرین کی لاش آئی تھی اسی پر لوگ انھیں ڈال کر گھر واپس لے گئے، رخسانہ، باپ کے انتظار میں کھڑی تھی، اس نے جو اس حال میں باپ کو آتے دیکھا، تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، وہ

"میرے ابا!"

کہتی ہوئی دوڑی، ٹھوکر لگی، گر پڑی، اور منہ لہولہان ہو گیا، عورتیں خبر لی کی دیکھ بھال میں لگ گئیں، اور مرد حاجی صاحب کو لخلخہ سنگھانے لگے!

"دس روپے خرچ ہو گئے!"

خاتون نے کہا،

"بھاڑ میں جائیں، تمھارے دس روپے، میں کہتی ہوں، دس نہیں سو خرچ ہو جائیں، تو بھی نفع میں رہو گے، اور ثواب الگ!"

امجد نے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر کہا،

"کیا مطلب؟"

خاتون نے جواب دیا،

"وہ زیور بیچا تھا، رخسانہ کا تم نے یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے!"

"اور وہ چار سو روپے جو داب لیئے تھے؟"

امجد نے کوئی جواب نہیں دیا، باہر چلا گیا، جاتے جاتے اس کے کان میں خاتون کی آواز آئی،

"آدھ پاؤ، حلوان کا گوشت لا دو، بڑے میاں بہت کمزور ہو گئے ہیں، حکیم صاحب یخنی بتا گئے ہیں!"

امجد کو خود اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا، کہ کس عورت سے پالا پڑا ہے، خود ہی تو مشورہ دے کر چار سو روپے، زیور کی قیمت میں سے کاٹے، اور خود ہی طعنہ دے رہی ہے، اور پھر آپ ہی پارسا بن کر ثواب لوٹ رہی ہے، واقعی عورت کا شمار عجائبات المخلوقات میں ہے، اس کا کچھ ٹھیک نہیں،

نسرین بیگم کی وفات نے ان کے بدن، اور روح دونوں کو زخمی کر دیا تھا، وہ اب دُنیا سے اور زندگی سے بیزار ہو گئے تھے، اگر رخسانہ سنگ راہ نہ ہوتی تو شاید وہ خودکشی کر چکے ہوتے، آخر اب دنیا میں ان کے لیے رہ کیا گیا تھا؟

قبرستان سے وہ چار آدمیوں کے کاندھے پر نیم مردہ حالت میں گھر واپس آئے، رخسانہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہ آگ کی طرح جل رہا تھا،

وہی خاتون، جس نے رخسانہ کی چپا کلی اپنے شوہر کی معرفت بکوائی تھی، اس وقت بہت کام آئی، اس نے دیکھا، رخسانہ رو رہی ہے، اور حاجی صاحب موت سے کشتی لڑ رہے ہیں، اسے ترس آگیا، اس نے رخسانہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، اور شفقت کے ساتھ کہا،

"رو نہیں بیٹی ——— اچھے ہو جائیں گے بڑے میاں میں ابھی حکیم کو بلاتی ہوں!"

فوراً وہ دوڑی دوڑی اپنے شوہر امجد کے پاس گئی، اور اسے حکم دیا کہ فوراً حکیم صاحب کو لے آؤ، حکیم صاحب فوراً آگئے، انھوں نے دیکھا بھالا، نسخہ لکھا، اور باہر آکر امجد سے کہا،

خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، کسی فوری صدمہ نے ان کی یہ حالت کر دی ہے، انشاالله اچھے ہو جائیں گے، لیکن دوا برابر استعمال ہونی چاہیئے!"

امجد نے دوا لا کر بیوی کو دی، اور کہا،

رفاقت کا حق ادا کر دیا، رخسانہ کو، یا حاجی صاحب کو ہرگز اس کی امید نہیں تھی، کہ خاتون، جیسی بگڑے دل کی عورت اس طرح کام آئے گی، لیکن، خدا کی باتیں خدا ہی جانے،

کوئی پندرہ بیس روز کے بعد حاجی صاحب اس قابل ہوئے کہ چل پھر سکیں، وہ باہر جا رہے تھے کہ خاتون مل گئی، اس نے کہا،

"کہاں چلے بڑے میاں؟"

وہ کمزور آواز میں بولے،

"ذرا باہر جا رہا ہوں!"

اس نے پوچھا،

"کیوں؟ کیا کام ہے؟"

"کام کیا ہے بہن؟ ——— وہی تلاش روزگار، ذرا ٹھیکیدار کے ہاں تک جا رہا تھا!"

خاتون نے حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا، اور واپس لے آئی اور پھر انھیں چارپائی پر بٹھا دیا، کہنے لگی،

"یہ نہیں ہو سکتا ——— ابھی ایک ہفتہ تک آپ کو باہر جانے کی اجازت نہیں!"

حاجی صاحب کی آنکھوں میں یہ بے لوث ہمدردی دیکھ کر آنسو آ گئے، انھوں نے کہا،

"بہن پھر کام کس طرح چلے گا؟"

جلتے بھُنتے، شہر گئے، وہاں سے، حلوان کا آدھ پاؤ کے بجائے پاؤ بھر گوشت لائے اور خاتون کو دیا، خاتون کی ساری عمر کھلاتے پکاتے اور گھر سنبھالتے گزری تھی، اس نے کہا،

"کتنا ہے؟"

ذرا جھلّائے ہوئے بولے،

"پاؤ بھر!"

وہ بولی،

"لیکن میں نے آدھ پاؤ کہا تھا، نواب صاحب!"

بہت زیادہ جھلّا گئے،

"میں بھی تو کھاؤں گا! ———— اتنے دن ہو گئے کھلائے ہوئے!"

خاتون گوشت لے کر پکانے چلی، اور بولی،

"ابھی زبان کے چٹخارے نے تو اس درجہ کو پہنچایا ہے!"

امجد نے بیڑی سلگائی، اور باہر چلا گیا، وہ زیادہ بحث مباحثہ کا قائل نہیں تھا،

کئی دن تک حاجی عبدالستار بستر سے چپکے رہے، بخار ٹوٹا تو کمزوری نے آن دبوچا، لیکن، اس عرصہ میں خاتون نے جس دلدہی سے خدمت کا خیال رکھا، اور جس جوش خدمت سے حاجی صاحب کو یہ میزی کھلاتی پاس سے کھلاتی اور دوا اپنی گرہ سے منگا کر پلاتی رہی اس سے

آنسو پونچھے، اور باپ سے کہا:

"مان لیجیے ان کا کہنا!"

حاجی صاحب، پاؤں اٹھا کر بیٹھ گئے، اور بڑی دیر تک خاتون کی دلدہی اور دل جوئی کرتے رہے،

ایک ہفتہ تک خاتون نے حاجی صاحب کو گھر سے نکلنے نہیں دیا، اب وہ بالکل اچھے ہو چکے تھے، کمزوری بھی دور ہو چکی تھی، بڑھاپے کے علاوہ کوئی بیماری نہیں تھی انھیں، اس ساری مدت میں واقعی خاتون نے جو کہا تھا، وہ کر دکھایا، اس نے حاجی صاحب کی خدمت ایک سگی بہن کی طرح کی، اور انھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی، اس کا تقریباً تین سو روپیہ حاجی صاحب پر خرچ ہو گیا، مگر اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی،

لیکن اب حاجی صاحب کا ارادہ بدل چکا تھا،

پہلے ان کا خیال تھا کہ پھر اپنی سابقہ جگہ پر چلے جائیں ٹھیکیدار یقیناً پھر انھیں کام پر لگا لے گا، اور اگر رہ جاتے، وہ لگا بھی لیتا، لیکن اب ان کا ادھر سے دل اچاٹ ہو چکا تھا، اس شہر کو اپنے لیے اب وہ سمجھتے تھے کہ راس نہیں آئے گا، یہیں نیاز نے دم توڑا، یہیں محسن نے داغ جدائی دیا، ہر وقت، جب سے وہ بستر علالت سے اٹھے تھے، ان دونوں کی یاد انھیں ستاتی رہتی تھی، وہ چاہتے تھے اس شہر کو چھوڑ دیں، کہیں، اور چلے جائیں، ایک روز رخسانہ سے انھوں نے کہا،

وہ بولی،

"چل جو رہا ہے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"لیکن کہاں تک؟"

ایک بہن کے انداز میں اس نے جواب دیا،

"جب تک" وہ "کما سکتے ہیں ——————

حاجی صاحب نے بات کاٹی،

"بہن مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو، تم نے مجھ پر اور میری دکھیاری بچی پر جو احسان کیا ہے، میں اس کا نہ شکر ادا کر سکتا ہوں، نہ بدلے سکتا ہوں، خدا ہی اجر دے گا تمھیں، لیکن، جب تک، میں مجبور تھا تمھاری روٹیاں کھاتا رہا، اب تو اچھا ہو گیا!"

کہنے لگی،

"بڑے اچھے، میں نہیں مانوں گی، بہن کہا ہے، تو بھائی کی طرح کہنا مانیئے، اللہ جانتا ہے، میرے بھائی، میرے اشارے پر چلتے تھے

اور وہ پھوٹ کر رونے لگی، اسے اپنے وہ دونوں بھائی یاد آ گئے، جو اسے بہت زیادہ چاہتے تھے، اور جنھیں سکھوں نے موت کے گھاٹ، صرف اس لیے اتار دیا تھا کہ وہ مسلمان تھے، ان کی بے بسی کی موت کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا، اور اس کے آنسوؤں کا دھارا بہ نکلا، رخسانہ آگے بڑھی، اس نے اپنے دوپٹے سے اس کے

رخسانہ نے کہا،

"ساری خلقت تو آج کل بے ٹکٹ سفر کر رہی ہے، گورمنٹ بھی کچھ نہیں کہتی، جانتی ہے مہاجرین کے پلّے کچھ نہیں، بے ٹکٹ چلیے!"

حاجی صاحب بولے،

"یہ بات، حاجی عبدالستار کی بیٹی کہہ رہی ہے؟"

اس نے جواب دیا، ذرا ندامت کے ساتھ،

میں نے تو ایک بات کہی تھی، !"

حاجی صاحب نے کہا،

"اب نہ کہنا، ——— میں پاپیادہ چل سکتا ہوں، لیکن بے ٹکٹ نہیں جاؤں گا، یہ نہیں ہو سکتا!"

رخسانہ نے مشورہ دیا،

"تو ٹھیکہ دار صاحب سے کہیے، وہ تو آپ کے بڑے ہمدرد ہیں!"

"ہاں نہیں ——————— اب ان کے پاس نہیں جاؤں گا، حد ہوتی ہے، احسان اٹھانے کی، میری تو ہمت اب ان کے سامنے جانے کی نہیں پڑتی!"

بات معقول تھی، رخسانہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا، وہ خاموش ہو گئی، حاجی صاحب نے کہا،

"بیٹی پھر؟"

وہ بولی،

"بیٹا، اب اس شہر میں جی نہیں لگتا!"

وہ ان سے سو فیصدی متفق تھی، کہنے لگی،

یہی حال میرا بھی ہے ابا جان، یہ شہر تو اب کاٹنے کو دوڑتا ہے

چلئے یہاں سے!"

لیکن کہاں؟

"کہیں بھی ——— کراچی چلیئے!"

کراچی کا نام لیتے وقت اس کا دل دھڑکنے لگا، نسرین بیگم کہا کرتی تھیں، ریاض کراچی میں ہے، اس لئے سوچا کہ کراچی جانے کے بعد اگر ریاض نہ ملا، تو امید کا جو دیا دل میں ٹمٹما رہا ہے، بجھ جائے گا، اس امید میں ساری زندگی گزر جائے، یہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ امید یاس سے بدل جائے، اس نے کہا،

"کراچی نہ سہی، راولپنڈی سہی!"

حاجی صاحب کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے،

"کراچی چلیں گے!"

یہ انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ رخسانہ کچھ نہ کہہ سکی، سوائے اس کے،

"اچھی بات وہیں چلیئے، ——— تو کب ارادہ ہے آپ کا"

وہ بولے،

"بیٹے، میں تو آج کیا ابھی چلا جاؤں، لیکن کرایہ کا کیا انتظام ہو گا

"کہو کیا کام ہے؟"

رخسانہ نے گٹھڑی کھول کر سامنے رکھدی، خاتون نے ساڑھیاں اور دوپٹے دیکھے، اور کہا،

"یہ کیا ہے؟"

"انھیں بکوا دیجیے!"

وہ حیرت سے بولی،

"کیوں بیٹی؟"

رخسانہ نے کہا،

"ابا کا جی اب یہاں نہیں لگتا، روزگار بھی چھوٹ چکا ہے کراچی جائینگے!

"وہاں کون ہے؟

"ہے تو کوئی نہیں، لیکن اب وہیں جانے کا فیصلہ کیا ہے ہم نے، یہاں ہر وقت پھوپھی اور بھائی جان مجھے اور ابا کو یاد آتے رہتے ہیں!"

رخسانہ رونے لگی، خاتون کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،

"اچھا!"

پھر بولی،

"یہ یہاں چھوڑ جاؤ، وہ تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے، تو انھیں بازار بھیجوں گی!"

رخسانہ اپنی پونجی، خاتون کو دے کر واپس آ گئی، حاجی صاحب نے

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ابا! ——— لیکن ہاں، ایک بات یاد آئی!"

"کیا؟ کہو!"

"میرے پاس، سچے کام کی بنارسی ساڑیاں، اور کئی دوپٹے ہیں انھیں فروخت کر دیں؟"

حاجی صاحب کو یاد آ گیا، یہ چیزیں اس نے بڑے شوق سے خریدی تھیں، انھوں نے خود ہی حاجی اسحٰق گوٹے والے کی دوکان سے لا دی تھیں، اب کس دل سے کہتے ہاں انھیں فروخت کر دو، خاموش ہو رہے،

رخسانہ نے کہا،

"تو میں جاتی ہوں؟"

حاجی صاحب نے اب بھی جواب نہ دیا، رخسانہ نے خاموشی کو رضامندی پر محمول کیا، اور چپکے سے، اپنے سرہانے سے ایک چھوٹی سی گٹھری اٹھائی، چلی خاتون کی طرف،

رخسانہ کو دیکھ کر خاتون نے پوچھا،

"کیسے آنکلیں بیٹی؟"

وہ لجاتی ہوئی بولی،

"ایک کام تھا!"

اس نے بڑے چاؤ سے پوچھا،

"کیوں ری بے مروت کبھی ہمیں یاد کر لیا کرے گی؟ ----------

یہ لے!"

اور یہ کہہ کر خاتون نے، چار سو روپے، رخسانہ کے ہاتھ پر رکھ دیئے
اس سودے میں خاتون نے نہ صرف یہ کہ کوئی بے ایمانی نہیں کی تھی بلکہ
اپنے پاس سے، سو روپے ملا دیئے تھے، وہ اب رخسانہ کا ایک پیسہ بھی
اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی تھی، تین سو کے قریب اس نے، حاجی
صاحب کی تیمار داری پر خرچ کیے تھے، یہ سو روپے بچے تھے، یہ دے کر،
اس نے دل ہی دل میں حساب کتاب برابر کر لیا، امجد نے بالا بالا،
پان سگریٹ کے لیئے، دس بیس روپے اڑا دیئے ہوں، اس کی وہ قسم
نہیں کھا سکتی تھی روپے دے کر بولی،

"کب کا ارادہ ہے؟

رخسانہ نے کہا،

"انشاء اللہ صبح!"

"ارے اتنی جلدی؟"

حاجی صاحب بولے،

"یہ شہر اب کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے بہن!"

تھوڑی دیر بیٹھ کر، خاتون چلی گئی، اس کے جانے کے بعد، رخسانہ نے
روپے باپ کے ہاتھ پر رکھ دیئے، حاجی صاحب نے روپے لے کر، اور
حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا،

پوچھا،

"کیا ہُوا؟"

"رکھ آئی ہوں، شام تک بکوا دیں گی!"

"خاتون کے پاس گئی تھی بیٹی؟"

"اور کون ہمارا ہمدرد بیٹھا ہے، ابّا جان!"

حاجی صاحب نے کہا،

"تو اب اللہ کا نام لے کر تیاّری سفر کرو!"

تیاّری ہی کیا کرنا تھی؟ پھر بھی، رخسانہ اپنے ٹوٹے پھوٹے سامان کو سمیٹنے لگی، حاجی صاحب نے کہا،

"اگر آج روپے مل گئے، تو انشا اللہ کل صبح کی گاڑی سے چلدیں گے"

باپ بیٹی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خاتون آ گئی، اس نے حاجی صاحب سے کہا،

"کراچی جا رہے ہو؟"

وہ بولے،

"ہاں بہن ——— اب تو یہی فیصلہ کیا ہے!"

آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی،

"کبھی کبھی خط لکھ دیا کرنا!"

"ضرور لکھوں گا بہن ——— تم نے تو نسرین کا غم کم کر دیا"

رخسانہ سے اس نے پوچھا،

رخسانہ چپ ہو گئی، خاتون نے پوچھا،

"تجھے حیرت ہے؟"

وہ بولی،

"ہاں یہ سوچتی ہوں کہ اتنے زیادہ دام کیسے مل گئے؟"

خاتون اپنی چوری کا حال نہ کہہ سکی، کیسے کہدیتی، پہلے میں بے ایمان تھی، تمہارے روپے میں نے مار لیے تھے، اب ایمان دار بن گئی ہوں، اور اس رقم میں، میں نے کوئی تصرف نہیں کیا ہے، جوں کی توں ساری لاکر تمھارے سامنے رکھدی، بلکہ پہلے کی رقم میں سے بھی سو روپے جو باقی رہ گئے تھے، میں نے ملا دیئے۔ پھر بھی اس نے کہا،

"شاید تو سوچ رہی ہے کہ زیور کے دام تو کم ملے، اور اس کے ٹھیک یہی بات ہے نا؟"

رخسانہ بولی،

"جی!"

خاتون نے کہا،

"بیٹی، جب میں اور اب میں بڑا فرق ہو گیا ہے، پہلے ہمارا کوئی جاننے والا نہیں تھا، جس نے جو دام دیئے لے لیے، اب یہ بات نہیں ہے، ٹھونک بجا کر بیچا ہے!"

رخسانہ نے کہا،

"تم کتنی اچھی ہو!"

"یہ تو چار سو ہیں!"
رخسانہ کو بھی حیرت ہوئی، وہ بولی،
"چار سو؟"
"ہاں ہاں، دو دفعہ گن چکا ہوں، تو بھی گن لے!"
رخسانہ بولی،
"کہیں بھول تو نہیں ہو گئی ——— جب سونے کا زیور اتنا سستا، بلکہ کوڑیوں کے مول بک گیا، تو یہ ساڑیاں اتنی مہنگی کیسے بک گئیں؟ ——— ضرور کچھ بھول ہوئی ہے!"
حاجی صاحب نے روپے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،
"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، جا، پوچھ آ!"
رخسانہ خاتون کے ہاں پہنچی، وہ بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی!
"رخسانہ تو؟ ——— خیر تو ہے!"
رخسانہ نے پوچھا،
"کچھ آپ کے روپے تو ان روپوں میں نہیں مل گئے؟"
خاتون نے کہا،
"نہیں تو!"
رخسانہ نے کہا،
"لیکن یہ تو چار سو روپے ہیں!"
"ہاں بیٹی، اتنے میں تمھارا مال بکا!"

"۴۵ برس کی عمر میں بھی جوانی کی قسم کھاتی ہو! ـــــــــ اچھا جاتا ہوں بھئی!"

رخسانہ، گھر پہنچی، اور حاجی صاحب کو سارا ماجرا سنایا، انھوں نے سنکر آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور کہا،

"اللہ کے ایسے نیک بندے بھی موجود ہیں ـــــــــ سچ ہے ایسے ہی لوگوں پر، یہ دُنیا قائم ہے، ورنہ کب کی قیامت آگئی ہوتی!"

اب رات ہو چلی، جلدی جلدی، یہ لوگ اپنا مختصر سا سامان سفر ٹھیک کرنے لگے، حاجی صاحب نے کہا،

"جلدی سے نماز پڑھ کر سو جا، صبح جلدی سے اُٹھنا ہے!"

اور خود مسجد میں چلے گئے،

آج حاجی صاحب نے بھی، مسجد میں زیادہ وقت نہیں صرف کیا نماز پڑھی، اور آکر بستر پر لیٹ گئے، صبح کوئی چار بجے کے قریب وہ اُٹھے، رخسانہ کو اٹھایا، سامان کاندھے پر رکھا، اور کہا،

"چل بیٹی!"

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ خاتون چلی آرہی ہے، اس نے کہا،

"یوں چپکے چپکے جاؤ گے، بغیر ملے ہوئے؟"

رخسانہ نے کہا،

"اتنے سویرے اٹھانے کو جی نہ چاہا!"

خاتون نے ایک چھوٹی سی پوٹلی رخسانہ کی طرف بڑھا دی،

خاتون بولی،
"جا اپنا کام کر، مجھ سے مذاق نہ کر!"
رخسانہ کی اس ذراسی تعریف نے، خاتون کو آسمان پہ پہنچا دیا تھا،
وہ بہت خوش تھی، اس کا جی چاہ رہا تھا، کاش میرے پاس ہزار روپے
ہوتے، اور میں اس معصوم لڑکی کو دے دیتی،
یہ سوچ رہی تھی کہ، امجد آ گیا، اس نے کہا،
"سنتی ہو؟"
"کہو، کیا ہے؟"
"رخسانہ، اور بڑے میاں کل کراچی جا رہے ہیں!"
"ہاں جا رہے ہیں تو؟"
وہ منہ بنا کر بولی،
"تو یہ کہ ناشتہ ان کے ساتھ جائے گا!"
امجد کو غصہ آ گیا، اس نے کہا،
"یہ کیا تم نے تماشہ لگا رکھا ہے، میں نہیں جاؤں گا اب بازار—

وہ بولی،
"جوانی کی قسم، اگر تم نے آدھ سیر قیمہ ابھی لا کر نہ دیا، تو بڑے میاں
سے سارا تمہارا کچا چٹھا ابھی کہہ دوں گی جا کر"
امجد کو ہنسی آ گئی،

کو پیچھے ہٹایا، اور بڑی مشکل سے راستہ بنا کر ان سے کہا۔

"چڑھ جاؤ جلدی سے!"

حاجی صاحب نے رخسانہ کو بھی اسی گروہ میں شریک کر دیا، اور کہا، بیٹی، کسی طرح گھس گھسا کر اندر پہنچ جا، میری فکر نہ کر، اب انشاء اللہ کراچی میں ملاقات ہوگی،

رخسانہ، ساتھی خواتین کے ریلے میں شریک ہو کر چلتی اور دبتی ہوئی پہنچ گئی، اندر پہنچ کر اس کا دم گھٹنے لگا، ہوا بند تھی، اور ۳۰ آدمیوں کے ڈبہ میں، دو سو عورتیں گھسی ہوئی تھیں، بہر حال کسی نہ کسی طرح اپنے پاؤں ٹکائے، اور ایک بڑے بکس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی،

گاڑی نے سیٹی دے دی، مگر، حاجی صاحب اس ڈبہ سے اس ڈبہ کو جھانکتے رہے، جگہ نہ ملنا تھی، نہ ملی، اب واپس جانا بھی ناممکن تھا، کیونکہ رخسانہ کسی طرح بھی برآمد نہیں کی جا سکتی تھی، اور اسے اکیلا کس طرح وہ کراچی جانے دیتے،

بہت سے لوگ پائدان پر کھڑے تھے، اور بہت سے ریل کی چھت پر، براجمان تھے، حاجی صاحب بھی بڑی مشکل سے چھت پر پہنچ گئے وہ پہنچے ہی تھے کہ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ روانہ ہوئی، وہ گرتے گرتے بچے، ایک نوجوان نے انھیں سنبھال لیا اور گاڑی رینگتے رینگتے، دوڑ پڑی، جو لوگ اندر تھے، وہ بھی جہنم میں تھے لیکن جو پائیدان یا چھت پر تھے، وہ تو واقعی آگ میں تپ رہے تھے، اور خطرہ سے کھیل رہے تھے،

"یہ لو!"

حاجی صاحب نے پوچھا،

"یہ کیا ہے؟"

وہ بولی،

"ناشتہ ——— اتنا لمبا سفر ہے!"

رخسانہ نے چپکے سے پوٹلی لے لی، اور یہ مختصر سا قافلہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا،

اسٹیشن پہنچکر، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، نظام الدین کے اسٹیشن پر بھی قیامت کا ہجوم تھا، لیکن لاہور کا نظام الدین سے مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا، نظام الدین کے اسٹیشن پر خلقت کا ہجوم تھا، اور یہاں، انسانوں کا سمندر لہریں لے رہا تھا،

حاجی صاحب وقت سے بہت پہلے، اسٹیشن پہنچ گئے تھے، یہ حال دیکھ کر رخسانہ نے کہا،

"اتنے آدمی؟ ——— جگہ کیسے ملے گی؟"

"اللہ مالک ہے، ——— آؤ!"

اور یہ دونوں کمزور نحیف انسان، انسانوں کے اس سمندر میں دو حقیر قطروں کی طرح گم ہو گئے،

زنانے درجہ میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، لیکن ایک جی دار آدمی اپنی عورتوں کو سوار کرنے آیا تھا، اس نے دھکا دے کر آدمیوں

"رخسانہ!"

اور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، باپ نے بیٹی سے پوچھا،

"راستہ کیسا کٹا؟"

وہ بولی،

"پہلے آپ بتائیے!"

حاجی صاحب نے سوچا، ذرا اکڑی ہوئی کمر سیدھی کرلیں، وہ بھی اکڑ بیٹھ گئے، اور ساری رام کتھا مختصر الفاظ میں سُنا ڈالی۔ سنا کر رخسانہ نے کہا

"اب تم بتاؤ!"

وہ بولی،

"زندہ بچ گئی، شکر ہے خدا کا، ——— ایسا معلوم ہوتا تھا قیامت آگئی ہے، کوئی کسی کا پرسان حال نہیں تھا ——— ابا لاہور سے یہاں تک کھڑے کھڑے آئی ہوں!"

اتنے میں اسٹیشن کا ایک سپاہی آیا، اسے دیکھتے ہی حاجی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے،

"بیٹی جلدی کرو"

اور باہر اتر آئے، سپاہی نے کہا،

"یہ زنانہ ڈبہ ہے!"

وہ آگے بڑھ گیا، یہ خاموش ہو رہے، رخسانہ اپنا مختصر سامان لیکر نیچے اتر چکی تھی۔ دونوں باپ بیٹی اسٹیشن سے باہر آئے۔

موسم کی شدّت، حفاظت کا کوئی انتظام نہیں، اور انتظام ممکن بھی نہ تھا
کراچی تک پہنچتے پہنچتے، کئی آدمی پائدان سے نیچے گر پڑے، اور کئی چھت
سے لڑھک گئے، اور پھر سانس نہ لے سکے، یہ ان کی آخری سانس
تھی جو وہ لے سکے تھے، حاجی صاحب دن کی دھوپ میں پگھلتے، اور
رات کی سردی میں ٹھٹھرتے، ریل کی سخت اور مسلسل جنبش کے باعث
بغیر ارادے کے سجدے کرتے، لڑھکتے، اور کبھی کبھی قلابازی کھاتے،
یہ طویل سفر پورا کر رہے تھے، بھوک اور پیاس سے نڈھال ہوئے
جا رہے تھے، پیشاب نے بڑے بڑے حملے کیے، اور رفع حاجت
کی ضرورت نے بھی، انھیں، امتحان کی کسوٹی پر کسا، لیکن وہ ثابت
قدم رہے، اور اپنی جگہ ڈٹے رہے،

آخر خدا خدا کرکے، کراچی آیا!

امیدوں، اور آرزوؤں کا شہر!

جس طرح ریل پر چڑھنا مشکل تھا، اس سے زیادہ اس وقت اترنا
مشکل معلوم ہو رہا تھا، ڈبوں کے اندر آدمی ابل رہے تھے، پائدان والے
تو سب سے پہلے اتر گئے تھے، چھت والے منتظر تھے کہ ابلنے والوں
کا ریلا کم ہو تو عرش سے فرش پر آئیں،

حاجی صاحب سب سے آخر میں اترے، اترتے ہی زنانہ کمپارٹمنٹ
کی طرف لپکے، رخسانہ کو اب موقع ملا تھا، وہ اطمینان سے پاؤں پھیلائے
ایک پوری سیٹ پر دراز تھی، حاجی صاحب نے جھانکتے ہی آواز دی،

یہان بھی وہی نفسی نفسی کا عالم تھا، جتنے کمرے تھے، سب بھر
چکے تھے، بہت سے لوگوں نے مسافرخانہ کے کھلے صحن میں، ڈیرا ڈال دیا
تھا، یہی حاجی صاحب نے بھی کیا، ایک درخت کے تلے رخسانہ کو بٹھا کر
خود بھی بیٹھ گئے، اس نے کہا،

"ابا یہاں تو جگہ نہیں ہے!"

"ہاں بیٹے، بالکل نہیں ہے، لیکن جائیں کہاں؟ یہیں رہیں گے!"

"لیکن کہاں؟"

"اسی درخت کے نیچے!"

رخسانہ چپ ہو گئی، حاجی صاحب نے پوچھا،

"بیٹی تم نے کھانا بھی کھایا؟"

رخسانہ بولی،

"کہاں ابا؟ وہ ناشتہ کی پوٹلی، تو میرے چڑھتے وقت دھکا پیل میں
نہ جانے کہاں گر گئی، میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا، اور ہوتا بھی تو کیا
کوئی سودا ملنا تو نا ممکن تھا —— اور ابا آپ؟"

"بیٹی میں بھی مسلسل فاقے سے ہوں، اور جان پر بنی جا رہی ہے،
ٹھہرو میں باہر جا کر کچھ لاتا ہوں!"

وہ باہر چلے گئے، یہاں بہت سے مہاجرین تھے، اور خاص کر دلی
کے مہاجرین نے، کھانے پینے کی دو کانوں، اور خوانچوں کا سلسلہ شروع
کر رکھا تھا، ایک دوکان سے گرم گرم خمیری روٹیاں لیں، دوسری دوکان سے

اب سوال
یہ تھا کہ جائیں کہاں؟
رخسانہ نے پوچھا،
"اب چلیں گے کہاں؟"
وہ بولے،
"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں!"
ایک وکٹوریہ والا سامنے کھڑا تھا،
"گاڑی چاہیئے؟"
"ہاں بھئی چاہیے ——— کیا لوگے؟ بتاؤ"
"کہاں جائیے گا؟"
"کسی مسافر خانہ میں لے چلو!"
"چلیئے، ڈھائی روپے دے دیجئے گا!"

آخر دو روپے میں سودا ہوا گاڑی والے نے، مولید یا مسافر خانے کے سامنے آکر ان دونوں کو اتار دیا، دل ہی دل میں حاجی صاحب بہت جھلائے کہ اتنے ذرا سے فاصلہ کا کمبخت نے اتنا زیادہ کرایہ وصول کر لیا لیکن اصول کے پکے تھے، جو بات طے ہوگئی، ہوگئی چپ چاپ دو روپے اس کے حوالے کیے، اور اندر پہنچے۔

بڑھا دی، اور رخسانہ سے کہا،

"لو بیٹی، گھر بھی بن گیا، اور تم بے پردگی سے بچ گئیں، اب آرام کرو!"

رخسانہ نے کہا،

"ابا، یہ تو ٹھیک ہوا، جاڑوں کا موسم ہے، زمین پر لیٹنا پڑے گا چارپائی تو یہاں ہے نہیں، بازار میں کہیں پرانے گدے ملتے ہوں تو دو لے آیئے!"

حاجی صاحب نے کہا،

"واقعی ٹھیک کہتی ہو، زمین پر، اگر دری بچھا کر لیٹے تو نمونیہ فوراً ہو جائے گا، میں جاتا ہوں!"

وہ پھر، شہر کے گشت پر نکل گئے، نیا شہر، نہ کسی سے شناسائی، نہ ملاقات، ادھر سے ادھر چکر کاٹتے رہے، ایک جگہ کچھ پرانا فرنیچر، اور سامان نیلام ہو رہا تھا، یہ بھی وہاں پہنچ گئے، یہاں، اور چیزوں کے علاوہ نہایت پرانے لیکن بڑے مضبوط، اور موٹے مسہریوں کے گدے بھی، نیلام ہو رہے تھے، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں؟ فوراً بولی دیکر، مول لے لیا، سستے بل گئے، ایک گدا کوئی سات روپے میں پڑا،

کوئی مغرب کے قریب حاجی صاحب، اپنے نئے "غریب خانہ" پر پہنچے، رخسانہ دال چاول پکا چکی تھی، اور مغرب کے لیے وضو کر رہی تھی، حاجی صاحب کے گدے دیکھ کر بہت خوش ہوئی، وضو آدھا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی،

سینخ کے کباب خریدے، اور لدے پھندے رخسانہ کے پاس پہنچے، دونوں نے مل کر کھانا کھایا، پہلا لقمہ کھاتے ہی چودہ طبق روشن ہوگئے، کئی مسلسل فاقوں کے بعد، گرم روٹی، اور کباب ــــــ اس لذت کو کون بیان کر سکتا ہے! کھانا کھا کر، سامنے کے نل سے اوک میں پانی پیا، واپس آکر یہی ترکیب رخسانہ کو بتادی، وہ بھی اسی طرح پی آئی، پھر حاجی صاحب بولے۔

. . . .

"نہ جانے یہاں روزگار کب ملے؟ یہ تھوڑے پیسے جو ہیں، انھیں زیادہ سے زیادہ مدت تک استعمال کرنا ہے، میں جاتا ہوں اناج لے آتا ہوں، شام سے یہیں کھانے پکانے کا بندوبست کرو!"

رخسانہ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، وہ راضی ہوگئی، کہنے لگی،

"جائیے ــ آئیے ــــــ لیکن یہاں رات کو سردی بہت لگی اب جاڑا لگ رہا ہے!"

جاتے جاتے بولے،

"اچھا، اس کا بھی کچھ بندوبست کروں گا!"

حاجی صاحب نے سب سے پہلے تو حسب ضرورت، دال، چاول کچھ آٹا، اور ضروری مسالہ خریدا، پھر کچھ، موٹے موٹے بورے خریدے تھوڑا سا بانس، دو مزدور ساتھ لیے، اور مسافر خانے پہنچے، اناج وغیرہ تو رخسانہ کے حوالہ کیا، اور خود مزدوروں کے ساتھ مل کر، ایک چھوٹی سی بانسوں کی چہاردیواری بنائی، اسے بوروں سے مڑھا، چھت بھی انھیں بوروں کی

ناکردہ گناہ!

مولیدینا مسافر خانے کے کھلے میدان میں، ایک مختصر سے احاطہ میں
[..]س کے بوروں کا بنا ہوا گھر تھا، باپ بیٹی رہ رہے تھے، ساریاں اور دوپٹے
[..]کر جو رقم حاجی صاحب ساتھ لائے تھے، وہ اب ختم کے قریب
[..]ی اور اب تک کوئی روزگار نہیں مل سکا تھا، ہر روز صبح کو وہ گھر سے
[..]تے تھے اور شام کو واپس آتے تھے،

لیکن مایوس!

نہ جانے کتنی دوکانیں انھوں نے چھان ڈالیں، کہ سیلس مین کی
[..] مل جائے، یا کھاتہ لکھنے کا کام مل جائے، نہ جانے کتنے دفتروں میں
[..]گئے کہ چپراسی کا کام مل جائے، نہ جانے کتنے سیٹھوں کے گھر پہنچے، کہ
[..]ں کے پڑھانے کا کام انھیں سپرد کر دیا جائے، یہ سارے کام

"مل گئے؟"

"ہاں، لیکن، مشکل سے!"

رخسانہ نے جلدی جلدی نماز پڑھی، پھر مٹھا ٹھو سے ان گدوں کو بچ
مسہری سے، زمین پر بچھایا، حاجی صاحب نے، اپنا کمبل "اب رخسانہ کو دید
تھا، اس طرح اب اس کے پاس ۲ کمبل ہو گئے تھے، اور خود لسرعت نیم
لحاف لے لیا تھا، وہ ان کے لیے بہت کافی تھا، انہی گدوں پر بیچھ
دونوں نے کھانا کھایا، کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر عشا کی نماز پڑھی
سونے کے لیے لیٹ گئے۔

حاجی صاحب کی طبیعت کراچی آتے ہی بہل گئی، یعنی ان پر غم
صدمہ کی وہ کیفیت نہیں رہی، جس نے لاہور میں ان کی جان پہ بنا دی
تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، اب ان کا دل ٹھہر چلا ہے، آج ان کی باتو
میں وہ مایوسی نہیں تھی، جو لاہور میں نظر آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا
پھر سے غم سہنے، اور مصیبتیں برداشت کرنے کی اہلیت پیدا کرنے میں
کامیاب ہو گئے ہیں، اور بالکل یہی کیفیت رخسانہ کی تھی، وہاں وہ ہر وقت
بجھی بجھی سی، گھٹی گھٹی سی رہتی تھی، اس کی آنکھیں ہر وقت پرُآب رہتی
تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر وہ رو پڑتی تھی، لیکن اب وہ بھی پہلے کے
مقابلہ میں زیادہ چوکس دکھائی دیتی تھی، یہ تھا لاہور اور کراچی کا فرق
حالانکہ غم بھی اپنی جگہ قائم تھا، اور مصیبت بھی!
اور مستقبل کے پردے میں کیا چھپا تھا، یہ کسی کو کچھ نہیں معلوم

بل ہے، ورنہ مجھے اپنے اختیارات سے کام لینا پڑے گا!"

حاجی صاحب نے انسانیت کے نام پر کچھ اپیل کرنی چاہی تھی، لیکن اس نے موقعہ ہی نہ دیا، تند طوفان کی طرح آگے بڑھ گیا، اور حاجی صاحب تکتے رہ گئے، نہ اندر جاتے بنتی تھی، نہ یہاں باہر ٹھہرتے، رخسانہ کمرے میں یہ باتیں سن رہی تھی، اس نے پکارا،

"ابا!"

وہ اندر آ گئے، کہنے لگی،

"آپ نے کیوں نہ کہہ دیا، ہم نہیں جائیں گے، چاہے مار ڈالو!"

"کیسے کہہ دیتا؟"

"اچھا، اب آپ نہ بولیے گا، آنے دیجیے، میں سمجھ لوں گی، اس منیجر سے ——— یہ کوئی ہندوستان تو ہے نہیں، پاکستان ہے، کیا یہاں بھی ہم دربدر بھٹکتے پھریں گے، اور دھکے کھاتے پھریں گے؟"

حاجی صاحب نے سمجھایا،

"بیٹی، تم تو ناسمجھی کی باتیں کرنے لگیں!"

"کیوں ابا؟"

"پاکستان ہمارا ہے، ہم پاکستان کے ہیں، یہ سچ ہے لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم دوسروں کی جگہ پر قبضہ کر لیں، کیا آزادی ہم نے اسی لیے حاصل کی تھی؟"

"تو آخر کیا کریں؟ کہاں جائیں؟"

بڑی خوش اسلوبی سے وہ انجام دے سکتے تھے، لیکن قسمت ساتھ
تھی، اور وہ ہر جگہ مخالفت کرنے پر تلی ہوئی تھی،
کہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی!
شام کو وہ تھکے ہوئے پہنچے، آکے بیٹھے ہی تھے کہ مسافرخانہ کا منیجر
اس نے آواز دی،
"یہاں کون صاحب رہتے ہیں؟"
حاجی صاحب فوراً باہر نکلے،
"فرمایئے، میں رہتا ہوں!"
اس نے انھیں دیکھ کر حقارت سے کہا،
"یہ تانا بانا، آپ نے کس کی اجازت سے بُنا؟"
حاجی صاحب نے کہا،
"میدان میں اتنے سارے آدمی رہ رہے ہیں، سب ہی نے کپڑے
یا چادروں کے مکان بنا رکھے ہیں، میں نے بے پردگی کے خیال سے
بوروں کا بنا لیا!"
منیجر نے کہا،
"جی وہ بانس کے ستونوں پر نہیں قائم ہیں، آپ نے یہاں کی زمین
خراب کی، منظر بگاڑا!"
حاجی صاحب چپ ہو گئے، وہ بولا
"میں ایک ہفتہ کی مہلت دیتا ہوں، اس عرصہ میں یہ اپنا محل ہٹا لیجئے

پاکستان کی سرحد میں پہنچکر، اسی مسافر خانے کے، ایک کمرے میں مقیم تھیں شریف عورت تھیں، لیکن بہت خاموش خاموش، کچھ طبعاً کم سخن تھیں کچھ غموں نے قوت گویائی سلب کر لی تھی، تیسرے چوتھے دن گھڑی دو گھڑی کو یہ آجاتی تھیں، اور کبھی کبھی رخسانہ بھی ان کے ہاں چلی جاتی تھی۔ رخسانہ کا جی بیٹھے بیٹھے گھبرانے میں نہ لگا، نہ جانے کیوں گھبرا سا رہا تھا، اس کا جی چاہا، تھوڑی دیر کے لیے سلیمہ کے ہاں چلی جاؤں، اتنے میں اس نے دیکھا، سارا مسافر خانہ زیروزبر ہو رہا ہے، ایک ہنگامہ سا ہو رہا ہے، تیزی سے لوگ باہر بھاگ رہے ہیں، اور باہر سے نعرے لگاتے ہوئے اندر آ رہے ہیں،

پھر اس نے دیکھا،

بہت سے لوگ جو آرہے ہیں، لدے پھندے ہیں، کپڑا سینے کی مشینیں، اناج، گھی کے پیپے، خشک فروٹ، کپڑوں کے تھان، سلے ہوئے کپڑے، سونے چاندی کے زیورات، چارپائی، بستر!

اور ان لوگوں کے چہروں پہ فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی ہے!

بڑے خوش ہیں، جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو!

رخسانہ کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں حیران تھی کہ آج یہ کیا ہو رہا ہے؟ روتے ہوئے چہرے ہنس کیوں رہے ہیں؟ یہ سامان کہاں بٹ رہا ہے، جس سے یہ نعرے لگاتے ہوئے خوشی خوشی آرہے ہیں؟ اتنے میں اس نے دیکھا کہ سناٹا سا چھا گیا، لوگوں کے نعرے

"گھبراتی کیوں ہو، خدا کوئی سبیل نکالے گا!"

حاجی صاحب نے رخسانہ کو تسلی دے کر خاموش کر دیا تھا لیکن خود ان کا دل بھی محشرستان جذبات بنا ہوا تھا، یہی سوالات، جو رخسانہ نے کیے تھے کانٹے کی طرح چبھ رہے تھے، بڑی دیر تک اسی سوچ بچار میں کروٹیں بدلتے رہے، لیکن آخر کار نیند آ گئی، اور وہ سو گئے،

صبح حسب معمول، پھر وہ شام تک کے لیے، گھر سے باہر نکلے، آج انھیں دو فکریں تھیں، ایک ملازمت کی، ایک کہیں، اور ٹھکانا بنانے کی، جاتے وقت رخسانہ سے انھوں نے پوچھا تھا،

"اب کتنے روپے رہ گئے ہیں؟"

اور ان کی چہیتی بیٹی نے، اپنے خزانہ کا جائزہ لے کر بتایا تھا،

"اسّی روپے، بارہ آنے!"

ذرا اطمینان ہوا، ابھی اتنی پونجی ہے کہ اگر مہینہ دو مہینہ نوکری نہ بھی ملے، تو بھی، دال روٹی، چل جائے گی، وہ چلے گئے، اور رخسانہ خاموشی سے آکر، اپنی جگہ بیٹھ گئی، حاجی صاحب کا پھٹا ہوا کرتا سامنے رکھا تھا، اس میں بیٹھ کر پیوند لگانے لگی، آخر وقت تو کٹے کس طرح؟ یہ پہاڑ سے دن کاٹے نہیں کٹتے تھے، نہ کسی کے ہاں آنا جانا، نہ کسی سے میل ملاقات، ہاں چند دنوں سے، سلیمہ بیگم سے تھوڑی بہت جان پہچان ہو گئی تھی، یہ بھی تو [illegible] رہنے والی تھیں، اور کسی طرح جان بچا کر، اپنی ایک لڑکی، دو جوان لڑکوں کی بھینٹ چڑھا کر، بوڑھے شوہر، اور دس بارہ سال کے لڑکے کو لے کر

نوجوانوں کے لیڈر نے کہا،
"اگر ہے تو بھی تم ہم سے کچھ نہیں لے سکتے۔"
پولیس افسر کو غصہ آ گیا،
"جانتے ہو کس سے باتیں کر رہے ہو؟"
جواب ملا،
"جی اچھی طرح، ——— مگر مطمئن رہیئے، آپ کو یہاں سے خالی ہاتھ واپس جانا ہوگا!"
وہ گرج کر بولا،
"یہ نہیں ہو سکتا!"
لیڈر نے کہا،
"نوجوان ہم چھوڑ آئے ہیں ہندوستان میں وہ دلا سئے ——— ہماری شرافت کی داد دیجئے، ہم نے کسی ہندو کی جان نہیں لی ہے، قتل نہیں کیا ہے، کسی عورت کی آبرو ریزی نہیں کی ہے، ننگا ناچ نہیں نچایا ہے، کسی بچہ کے اعضا نہیں کاٹے ہیں، گردن نہیں مروڑی ہے حالانکہ ہمارے ساتھ، ہمارے بچوں کے ساتھ، یہ سب کچھ ہو چکا ہے ہم نے صرف ان لوگوں کا مال لوٹا ہے، جو ہمارے ہتھے چڑھ گئے تھے اور اسے ہم واپس نہیں کریں گے، آپ اگر اپنی بندوقوں کی ہم پر مشق کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کر لیجئے، تلواریں چلانے کا شوق ہے، تو یہ گردن حاضر ہے!"

بند ہوگئے،

اور پولیس آگئی!

اس پولیس میں بھی وہی رعب و جلال تھا، جو ہندوستان میں صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص تھا؛ حالانکہ

وہ ہندو تھی!

اور یہ مسلمان تھی!

رخسانہ سوچنے لگی، یہ کیا بات ہے، یہ کیا ماجرا ہے؛

اتنے میں پولیس نے مورچہ بندی کر کے، اپنا کام شروع کر دیا،

مکمل ناکہ بندی!

نہ باہر سے کوئی اندر آ سکتا تھا، نہ اندر سے باہر جا سکتا تھا،

پھر پولیس نے حکم دیا،

"جس کے پاس جو کچھ مال آج کے فساد میں لوٹا ہوا ہو وہ لا کر سامنے ڈھیر کر دے! ورنہ سختی سے کام لیا جائے گا، اور کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی!"

بعض منچلے نوجوان آگے بڑھے، انھوں نے کہا،

"ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے!"

پولیس افسر نے کہا،

"ہے، میں نے خود تم لوگوں میں سے کئی کو یہاں سامان لاتے دیکھا ہے!"

میں وہی بات تمھیں یاد دلانا چاہتا ہوں،
وہ بات یہ ہے کہ تم مسلمان ہو، تم رحمۃ للعالمین کی اُمّت ہو، تم اس مذہب کے پیرو ہو، جو ہر حالت میں عدل کی تعلیم دیتا ہے۔ بیشک تم پر ظلم ہوا ہے، لیکن یہ ظلم کس نے کیا؟ ہندوستان کے ہندوؤں نے، کراچی کے ہندو بالکل بے قصور ہیں، وہ تمھارے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کرتے، انھوں نے تمھارا کچھ بھی نہیں بگاڑا ہے، اگر تم میں طاقت ہو تو تم ان ہندوؤں اور سکھوں سے بدلہ لے سکتے ہو، جنھوں نے تم پر ظلم کیا تمھیں قتل کیا، تمھارے بچوں کو مارا، اور عورتوں کو اغوا کیا، اور عصمت دری کی، لیکن کیا تم اس کا بدلہ ان ہندوؤں سے لوگے، جو تمھاری امان میں ہیں؟ حفاظت میں ہیں؟
تم اگر چاہو تو ایسا کر سکتے ہو، لیکن ایسا کرنے سے پہلے اعلان کرو کہ تم مسلمان نہیں ہو، تم نے محمدؐ ابن عبداللہ سے اپنا رشتہ قطع کر لیا، قیامت کے دن تم ان کے اُمّتی بن کر نہیں اٹھو گے!"
مجمع خاموشی سے زاہد حسین کی تقریر سن رہا تھا، پھر وہ پولیس افسر کی طرف مخاطب ہوئے، اور اس سے کہا،
تم اپنے سپاہیوں کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ!"
پولیس افسر اپنے ساتھیوں کو لے کر چلا گیا، زاہد حسین نے پھر مجمع کو مخاطب کیا، اور کہا،

پولیس افسر کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، اس نے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا،

"تیار ہو جاؤ ——— یہاں سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا!"

لیڈر نے کہا،

"ٹھیک ہے، یہ شوق بھی پورا کر لیجئے!"

اتنے میں، دو سوٹڈ بوٹڈ، آدمی آ گئے بڑھے، بڑھاپا آ چلا تھا لیکن چہرے تر و تازہ تھے، انھوں نے پولیس افسر سے کہا،

"یہ کیا تماشہ ہے؟"

وہ انھیں دیکھ کر سہم گیا، اور ہٹ کر الگ کھڑا ہو گیا، ان دونوں میں ایک ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر، مسٹر زاہد حسین تھے دوسرے پاکستان کے وزیر مالیات مسٹر غلام محمد تھے، پہلے غلام محمد نے امن داماں کی دعوت دیتے ہوئے ایک مختصر سی تقریر کی، پھر زاہد حسین کھڑے ہوئے، اور انھوں نے کہا،

"بھائیو!

تمھارا غم و غصہ بالکل بجا ہے، تمھاری دلیل بالکل سچی ہے تم نے جو کچھ کہا، میں نے سنا، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے، لیکن!

تم ایک بات بھول گئے!

وزیرِ مالیات، اور باؤنڈ کمشنر نے پولیس افسر کی طرف مسکرا کر دیکھا، اور کہا،

"یہ آپ کا مال مسروقہ موجود ہے اسے جائیے، اور یاد رکھیے، آپ مسلمان ہیں، اور یہ مہاجر بھی مسلمان ہیں، ان کے دل دکھے ہوئے ہیں، آپ سنگین کی نوک سے ان کے دل نہیں بدل سکتے، صرف اسلام کا واسطہ دے کر یہ کام کر سکتے ہیں، جو کام آپ کی مشین گنیں بھی نہیں کر سکتی تھیں، وہ کام صرف اسلام کے واسطہ نے انجام دے دیا، مسلمان بہت کچھ اپنے مذہب کو بھول چکے ہیں، لیکن ان کے سینہ میں اب تک اسلام کی آگ سلگ رہی ہے، ضرورت، صرف اسے کریدنے کی ہے!"

پولیس افسر خاموشی سے، اور کسی حد تک شرمندگی سے، یہ باتیں سنتا رہا، اور پھر سارا سامان لے کر، شاداں و فرحاں، پولیس چوکی کی طرف چل کھڑا ہوا،

پولیس کی یورش، اور آدمیوں کا بھرا ہوا مجمع دیکھ کر حالات دریافت کرنے کی غرض سے، رخسانہ، سلیمہ کے کمرے میں چلی گئی تھی، یہ سارا تماشا میں اس کے کمرے کے سامنے ہو رہا تھا،

پولیس کے چلے جانے کے بعد رخسانہ جب اپنے کمرے میں پہنچی تو یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئی، کہ ایک سینے کی مشین اس کے کمرے میں رکھی ہوئی ہے،

یہ مشین کیسے آئی؟

"مسلمانو!"

پولیس چلی گئی!

اب تم آزاد ہو، میں بھی جاتا ہوں، اگر تم چاہو، تو سارا لوٹا ہوا مال اپنے پاس رکھ لو، برتو، اور مزے اڑاؤ، لیکن ایک مرتبہ میں پھر کہتا ہوں کہ ایسا کرنے سے پہلے، یہ سوچ لو کہ کس منہ سے حشر کے دن تم اپنے رسول سے شفاعت کا سوال کروگے؟ اور اگر تم نے ایسا کیا تو کیا رسول اللہ تمھیں اپنا اُمتی مان کر تمھاری شفاعت کریں گے؟"

زاہد حسین کی تقریر ختم ہوئی، اور لوگوں نے انھیں گھیر لیا چند بڑے بوڑھے، آگے بڑھے، اور انھوں نے کہا،

"سارا مال حاضر ہے!"

اور وہی لیڈر جو پولیس افسر سے لڑنے مرنے کو تیار تھا، دوڑ دوڑ کر لوٹا ہوا مال وزیر مالیات، اور ہائی کمشنر کے سامنے ڈھیر کرنے لگا، تھوڑی دیر میں ان کے سامنے ہزاروں روپے کا مال جمع ہوگیا،

پولیس افسر، اپنے سپاہیوں کو باہر چھوڑ کر، خود بطور ایک تماشائی کے آگیا تھا، اور حیرت سے کھڑا ہوا یہ معجزہ دیکھ رہا تھا!

اسلام کے نام کا معجزہ!

وہ خود بھی مسلمان تھا لیکن اب تک اس نے اسلام سے نہ خود کوئی فائدہ اٹھایا تھا نہ دوسروں کو پہنچایا تھا،

اور حاجی صاحب اب تک لاپتہ تھے،

اب وہ اپنے دل کو تسلی نہ دے سکی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اس نے وضو کرکے فجر کی نماز پڑھی، نماز کے بعد رو رو کر، اپنے رب سے اپنے باپ کی سلامتی کی دعا مانگی، اور سیدھی سلیمہ کے ہاں پہنچی، وہ اب تک سو رہی تھی، رخسانہ نے اسے جگایا، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، اور اس کا حال زار دیکھ کر گھبرا گئی،

"کیا ہوا بیٹی؟"

رخسانہ نے کہا،

"ابا اب تک نہیں آئے!"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی، سلیمہ نے پوچھا،

"اب تک نہیں آئے؟"

"نہیں!"

"ضرور کوئی بات ہوئی ہے، خدا رحم کرے!"

وہ جائے نماز لپیٹی ہوئی اٹھیں، انھوں نے رخسانہ سے کہا،

"بیٹی، تم جاؤ، میں "انھیں" پتہ چلانے بھیجتی ہوں!"

رخسانہ پھر اپنے گھر آگئی، اور اب اطمینان سے رونے لگی، سلیمہ نے انسانیت کا واسطہ دے کر اپنے شوہر خدا بخش کو راضی کیا کہ وہ جلدی سے ناشتہ کرکے حاجی صاحب کا پتہ لگائیں۔

خدا بخش نے ناشتہ کیا، سب سے پہلے ہسپتال پہنچے، وہاں تمام مریضوں

وہ یہ سوچنے لگی، اس نے خیال کیا، پولیس کو سختی پر مائل دیکھ کر کسی شریر نے یہاں رکھ دی، کہ اگر تلاشی ہو، تو میں پکڑی جاؤں،

بہر حال اس نے مشین اٹھا کر ایک کونے میں رکھدی، اور باپ کا انتظار کرنے لگی،

مغرب کا وقت ہو گیا، مگر حاجی صاحب نہیں آئے، اس کا دل دھڑکنے لگا، دل سے پوچھنے لگی،

"ابا اب تک کیوں نہیں آئے؟ کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا؟"

پھر اس نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دی، اور کہا،

"وہ فساد میں کیوں حصّہ لینے لگے، کسی کام میں دیر ہو گئی ہو گی آتے ہی ہوں گے، اب؟"

عشا کا وقت ہو گیا!

مگر حاجی صاحب نہیں آئے؟

رات کے بارہ بج گئے،

مگر؟

گھڑیال نے دو بجائے،

اور؟

چار بج گئے!

رخسانہ اب تک، انتظار کر رہی تھی!

صبح ہو گئی!

رخسانہ نے پوچھا،

"یہ کیوں؟ کیسے؟"

وہ بولیں،

"یہ بھی کوئی فساد میں فساد تھا؟ ــــــــــــ فساد تو وہ تھا جو اوریں ہوا، بھرت پور میں ہوا، دلّی میں ہوا، گاجر مولی کی طرح آدمی کاٹ کر ڈھیر دیئے گئے، اور یہاں کا فساد؟ ــــــــــــ ہونہہ چند سکھ مار ڈالے گئے، وہ بھی اپنے ہی کرتوتوں سے، شاید چار یا پانچ ہندو بیٹ میں آ گئے، باقی کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی، ہاں لوٹے ضرور گئے تو جی، وزیروں نے تقریر کر کر کے اگلوا لیا، لیکن یہ خوڑو (کھرو) سے تا یہ پھر گیا، اور ساری پولیس کو لے کر چڑھ دوڑا، اور جیسے تیسے گرفتار کرنا شروع کر دیا، ــــــــــــ یہ مسلمان ہیں، اور ایک وہ ہندو تھے، جنھوں نے شہ دے دے کر مسلمانوں کو اپنی پولیس اور فوج سے قتل کرایا۔"

رخسانہ نے کہا،

"یہ تو سچ ہے، لیکن، اگر حکومت اتنی سختی نہ کرتی تو فساد بہت بڑھ جاتا، اور بہت سے ہندو بھی قتل ہو جاتے!"

منہ بگاڑ کر بولیں،

"کون سے ہمارے ناتے دار تھے، مو ئے ہو جاتے تو ہو جاتے!"

رخسانہ بولی،

کی چارپائی پر حاجی کو دیکھا، نہ مُردوں کی فہرست میں!

یہاں سے مایوس ہوکر، مختلف پولیس چوکیوں پر پہنچے، کئی جگہ گئے مگر کوئی پتہ نہیں چلا، آخر ایک جگہ، چل ہی گیا، معلوم ہوا، فسادیوں کے جس گروہ کو، مسٹر ایوب کھرو کی پولیس نے گرفتار کیا ہے، اس میں حاجی صاحب بھی ہیں، ضمانت نہیں ہو سکتی، دو چار دن کے بعد، مقدمہ عدالت میں پیش ہوگا۔

یہ خبر لے کر، خدا بخش، مسافر خانے پہنچے، انھوں نے اپنی بیوی سے کہا، انھوں نے آکر، رخسانہ کو یہ خوش خبری سنادی، وہ یہ سنتے ہی پھر رونے لگی، پھر اس نے پچاس روپے نکال کر سلیمہ کے ہاتھ پر رکھ دیے،

"زندگی بھر آپ کا احسان مانوں گی، میری یہی پونجی ہے، کوئی وکیل کراکر ابا کو بچا لیجئے!"

وہ راضی ہو گئیں، روپے انھوں نے لے لیے اور کہا،

"اطمینان رکھو، بچ جائیں گے، انھوں نے کیا ہی کیا ہے، بوڑھے آدمی، کسی کو مار دھاڑ نہیں سکتے، ایماندار اور متقی بھی، کسی کو لوٹ بھی نہیں سکتے، کہیں گھومتے گھامتے اسی طرف نکلے ہوں گے پولیس نے جلدی میں پکڑ لیا، وہ بیچارے بھی دھر لیے گئے ہوں گے! لیکن اطمینان رکھو، وہ ضرور چھوٹ جائیں گے!"

رخسانہ کو ذرا تسلی ہوئی، سلیمہ نے کہا،

"اور یہ تو بات کا بتنگڑ ہے!"

• ابھی انھیں بھیجتی ہوں وکیل کے ہاں!"

"یہ نہ کہیئے، کسی بے گناہ انسان کا خون بہانا، نیکی نہیں ہے،"
روتی ہوئی بولیں،

"ارے چھوڑو بھی بیٹی، یہ وعظ، ——————— تمھارا کوئی عزیز
قتل ہوا ہوتا موذیوں کے ہاتھ سے تب یہ باتیں کرتیں تو جانتی، میرے تو
جگر کے ٹکڑوں کو، ان جانوروں نے مرغی کی طرح ذبح کر دیا!"

اور وہ بے تحاشا رونے لگیں، رونے میں رخسانہ نے بھی ان کا
ساتھ دیا، اسے بھی، اپنے وہ عزیز یاد آ رہے تھے، جو اس فساد کی
قربان گاہ پر بھینٹ چڑھے تھے!

پھر رخسانہ نے ان کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھے، اور اپنی ساری
کی ساری سرگذشت سنائی، اور کہا،

"میرا دل بھی دکھا ہوا ہے، میرے دل میں گھاؤ پڑے ہیں، موت
کی دعا مانگتی ہوں، مگر آتی نہیں، زندہ ہوں، لیکن نہ اپنے لیے، نہ کسی
اور کے لیے، صرف موت کے انتظار میں ——————— لیکن
انہی زخموں، اور غموں نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ کسی بے گناہ کا دل نہ دکھاؤں
کسی بے خطا کی موت کا تماشہ نہ دیکھوں!"

رخسانہ کی سرگزشت سنکر، سلیمہ کی آنکھیں کھل گئیں، اس نے
عظمت اور عقیدت کی نظر سے رخسانہ کو دیکھا، اور کہا،

"بڑا دل ہے، بہت بڑا دل ہے، تیرا چھوکری! شاباش ہے تجھے"
رخسانہ کو داد دے کر وہ چلیں، چلتے چلتے کہہ گئیں،

واقعہ کچھ ایسا تھا کہ مجسٹریٹ اس سے زیادہ رعایت کر بھی نہیں سکتا تھا، حاجی صاحب کے قبضہ سے پولیس نے ایک گٹھڑی برآمد کی تھی، جس میں کچھ ریشمی کپڑے، اور چند طلائی زیورات تھے، پولیس کا بیان تھا کہ یہ مال لوٹ کا تھا، حاجی صاحب کا بیان یہ تھا، کہ میں فساد سے بے خبر، اپنے روزگار کی تلاش میں جا رہا تھا، کہ عین اس مقام پر پہنچا جہاں فساد کی گرم بازاری تھی، اتنے میں ایک آدمی دوڑتا ہوا میرے قریب آیا، اس نے کہا،

"چچا ذرا اسے پکڑنا، میں پیشاب کر کے ابھی آیا!"

وہ سامنے کی گلی میں چلا گیا، میں اس کی امانت ہاتھ میں لیے اس کا انتظار کر رہا تھا، کہ پولیس آئی، اس نے پوچھا،

"یہ کیا ہے؟"

میں جواب نہ دے سکا، ایک سپاہی نے گٹھڑی میرے ہاتھ سے لے کر کھولی، اور کہا،

"یہ تو لوٹ کا مال معلوم ہوتا ہے؟"

میں نے کہا،

"ہوگا، ———— وہ آدمی ابھی آتا ہے، پوچھ لیجئے اس سے!"

وہ آدمی نہیں آیا، پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا،

عدالت نے حاجی صاحب کے بیان پر اعتبار نہیں کیا، پولیس کا بیان صحیح سمجھا، اور سزا دے دی،

باب ۱۴

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟

سلیمہ کے کہنے سننے سے خدا بخش نے اپنے وقت کا بڑا حصہ حاجی صاحب کے مقدمہ کی پیروی میں صرف کیا، وہ ایک وکیل کے دفتر میں منشی تھا، وکیل آسانی سے ہاتھ آگیا، اور اس نے پیروی کے پچاس روپے خدا بخش سے پیشگی وصول کر لیے،

لیکن یہ وکیل حاجی عبدالستار کو جیل کی آہنی سلاخوں سے باہر نہ نکال سکا، مجسٹریٹ نے دوسرے لوگوں کو تو زیادہ مدت کی سزا دی لیکن حاجی صاحب کے بڑھاپے پر رحم کھا کر، ایک مہینہ کی قید سخت، اور سو روپیہ جُرمانہ، اور جُرمانہ وصول نہ ہو تو مزید پندرہ روز کی سزا دی حاجی صاحب نے پُرنم آنکھوں سے یہ فیصلہ سُنا، اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے جیل چلے گئے، خدا کا شکر وہ ہر موقع پر ادا کرتے تھے

پڑوسن جن کا نام اکبری تھا، کئی بار کثرت کار کی شکایت کر چکی تھیں،
رخسانہ سیدھی ان کے ہاں پہنچی، کہنے لگیں،
"کیسے آنا ہوا ہماری بڑی قسمت کہ تم نے آج قدم رکھا یہاں!"
رخسانہ انھیں خالہ کہتی تھی، کہنے لگی،
"خالہ ایک کام سے آئی ہوں!"
انھوں نے جواب دیا،
"بیٹا ہم کس لائق ہیں ——— کہو!"
رخسانہ نے کہا،
"آپ کہتی تھیں کہ آپ کے پاس کام اتنا زیادہ آجاتا ہے کہ نمٹائے نہیں نمٹتا!"
"ہاں تو؟"
"بچا ہوا کام مجھے دے دیا کیجئے ——— ابا جیل چلے گئے، اور تو کوئی ذریعہ ہے نہیں!"
کہنے لگیں،
"بڑے شوق سے! ——— کہو تو ابھی دے دوں؟"
وہ بولی،
"نیکی اور پوچھ پوچھ! لائیے!"
اکبری نے، کئی ٹکڑے سامنے لا کر رکھ دیئے، اس کی فراک بنے گی یہ کرتا سیا جائے گا، یہ غرارہ ہے، یہ دو شلواریں ہیں، یہ ایک

رخسانہ کو جب باپ کی سزایابی کا حال معلوم ہوا، تو وہ پچھاڑیں کھانے لگی، دلی کے فساد کے کشتگان ستم پر وہ اتنا نہیں روئی تھی، جتنا حاجی صاحب کی سزایابی پر اسے رونا آیا، حاجی صاحب کا سایہ اس کے سر پر تھا، تو وہ اپنے دل کو مضبوط پاتی تھی، لیکن ان کے جیل جانے کے بعد، وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی، کوئی نہیں تھا جس پر وہ بھروسہ کرتی، یہ اتنا بڑا شہر، اور وہ بالکل تنہا، بالکل اکیلی، یہ غم بھی اس کی قسمت میں لکھا تھا، اور اس نے یہ تلخ گھونٹ بھی پی لیا،

اب سب سے بڑا اور اہم سوال یہ تھا کہ زندگی کے یہ دن کس طرح بسر کرے؟ جو تھوڑی سی پونجی تھی وہ حاجی صاحب کے مقدمہ کی پیروی میں صرف ہو گئی، اتنے دن تک اسی سے کھانے پینے کا کام بھی چلا، اب اس کے پاس صرف تین روپے کچھ آنے تھے، یہ رقم بھلا کب تک ساتھ دے سکتی تھی؟

یہی سوچتے سوچتے اس کی نظر، سنگر مشین پر پڑی، جو اب تک اس کے جھونپڑے میں رکھی ہوئی تھی، پہلے دن اس مشین کے رکھنے والے کو اس نے شریر سمجھا تھا، لیکن آج وہ اسے فرشتۂ رحمت سمجھ رہی تھی، یہ مشین نہیں تھی اس کے رزق کا ٹھیکرا تھا، یہی اب اس کی کفیل تھی،

پاس کے جھونپڑے میں، انبالہ کی ایک خاتون رہتی تھیں، یہ سلائی کا کام کرتی تھیں، ان کے شوہر، شہر سے سلائی کا کام لاتے تھے، یہ سی کر وہ باہر بیچ آتے تھے، یہی ان دونوں میاں بیوی کا ذریعۂ معاش تھا، یہ

"روپے لے لیے چھوکری نے؟"

"نہ لیتی تو کرتی کیا؟"

زور سے ہنسے، اور فرمایا،

"یہ سودا بھی اچھا رہا، ——— گھر بیٹھے بیس روپے مفت کے ہیں بھی مل گئے ——— ہلدی لگی نہ پھٹکری، رنگ آیا چوکھا!"

اکبری بگڑ گئی،

"مفت کے کیوں ہوتے؟ دوڑتے دوڑتے تمھارے پاؤں نہیں گھس گئے؟"

"ارے ہاں تو کیا ہوا؟ بیس روپے بھی تو پا لیے! تمھیں تو کچھ نہیں کرنا پڑا، پھر یہ نفع ہوا یا نہیں؟"

رخسانہ بڑی تیزی سے کام کر رہی تھی، دن بھر سوا نماز پڑھنے اور کپڑے سینے کے اسے کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا، اکبری کو اس کی تیز دستی پر حیرت ہوتی تھی، رفتہ رفتہ وہ "کمیشن ایجنٹ" بن گئی تھی، یعنی خود آرام کرتی تھی، اور سارا کام، رخسانہ سے کراتی تھی، جو دام ملتے تھے، آدھے خود رکھ لیتی تھی اور آدھے رخسانہ کو دے دیتی تھی، رخسانہ نے کبھی بھی اجرت کی کمی بیشی پر اعتراض نہیں کیا، وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ کام کا سلسلہ منقطع نہ ہو، تقریباً ۵-۶ روپے روز کی مزدوری وہ کر لیتی تھی، اکبری بیگم نے جب اس سے خوب نفع کمانا شروع کیا، تو کوئی آئینہ میں مجھے کوئی آرسی میں" کے مطابق، اصرار کر کے، رخسانہ کا کھانا اپنے ذمہ کر لیا، کھلانے لگیں،

برقعہ ہے ——— چاہو تو سب لے لو، ہیں تو واپس کر رہی ہے۔"

"نہیں واپس نہ کیجیے، یہ سب کام میں کر لوں گی!"

اکبری نے سارے کپڑے رخسانہ کے حوالے کر دیئے اور وہ اپنے کمرے میں آکر اطمینان سے کام کرنے لگی، رخسانہ جس طرح اور باتوں میں طاق تھی، سینے پرونے میں بھی طاق تھی، ان اکبری صاحبہ کی اس کے سامنے کیا حقیقت تھی، اس نے اس خوبی، اور نفاست کے ساتھ سارے کپڑے سیئے کہ اکبری دنگ رہ گئیں، اس نے کہا،

"بیٹی تم تو اس فن کی استاد ہو!"

"واقعی بڑے اچھے سیئے ہیں!"

رخسانہ نے کہا،

"اب بتائیے نہیں مجھے!"

وہ بولیں،

"نہیں سچ ——— تم تو چھپی رستم نکلیں، اچھی مزدوری کر لو گی!"

رخسانہ کپڑے وہاں رکھ کر چلی آئی، اور شام کو اکبری نے مزدوری کے پیسے لا کر دے دیئے، یہ سارے کپڑے، رخسانہ نے تین دن میں سی ڈالے تھے، حالانکہ اکبری سے یہ کام ڈیڑھ ہفتہ سے کم میں ہرگز نہ ہوتا، اکبری نے کپڑوں کی سلائی ۲۰ روپے رخسانہ کے ہاتھ پر رکھی اور کچھ اور کپڑے دے کر چلی گئی، گھر پہنچی تو شوہر نے کہا

رخسانہ نے مشین کی طرف اشارہ کیا، اور کہا،

"ابا جان اس سے!"

اور پھر مشین سے لیکر، سلائی کے کام تک کی ساری تاریخ اس نے بیان کر ڈالی، اور کہا،

"میرے پاس اب دو سو بارہ روپے جمع ہیں، کہیں نوکری ڈھونڈھنے کے بجائے انہی سے کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کر دیجئے!"

حاجی صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے، کہنے لگے،

"ارے تُو تو اب سرمایہ دار ہے!"

رخسانہ کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، وہ چپکے سے اٹھی، اور روپے لا کر اس نے باپ کے ہاتھ پر رکھ دیئے،

دو تین دن تک تو حاجی صاحب نے جیل کی تھکن دور کی، جیل میں اگرچہ ان سے صرف لفافے بنانے کا کام لیا جاتا تھا، لیکن پھر بھی وہ بہت ہلکان ہو گئے تھے، جب ذرا ماندگی دُور ہوئی، تو انھوں نے رخسانہ کے جمع کیے ہوئے روپوں سے کاروبار شروع کر دیا، کیا یہ کہ ایک ٹھیلہ، سو روپے میں ایک آدمی سے خرید لیا، سو روپیہ کا بساط خانے کا سامان خرید، اور پھیری کرنے لگے، حاجی صاحب کے آنے کی وجہ سے اب رخسانہ کو چولھے ہانڈی کے کام میں پھر لگنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہُوا، کہ کام کی رفتار سُست پڑ گئی، پھر بھی تین، ساڑھے تین روپے روز وہ کما لیتی تھی، اور تین، ساڑھے تین روپے کا نفع حاجی صاحب

"تم اکیلی اپنے لیے ہانڈی چولھے کے بکھیڑے میں کیوں پڑو، مجھے تو ماشاالله کئی آدمیوں کا پکانا ہی پڑتا ہے، ایک تم بڑھ جاؤگی تو کون سے میرے ہاتھ گھس جائیں گے ؟"

درحقیقت اس احسان کا مقصد یہ تھا کہ رخسانہ، اور زیادہ بے فکر اور مطمئن ہو کر سلائی کا کام کر سکے، جتنا زیادہ وہ کام کرے گی، اتنا ہی زیادہ نفع ملے گا، رخسانہ نے کھانے کی قیمت دینے پر بہت اصرار کیا آخر وہ حاجی عبدالستار کی لڑکی تھی، لیکن اکبری نے ایک نہیں سنی، جب اس نے زیادہ کہا، تو جواب دیا،

"اب اگر تم نے پھر سے یہ بات کہی، تو خفا ہو جاؤں گی، الله جانے؟"

رخسانہ انھیں خفا نہیں کرنا چاہتی تھی، خاموش ہو گئی، ڈیڑھ مہینے تک مسلسل یہ سلسلہ جاری رہا، رخسانہ دن رات بڑی مستعدی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی،

آخر وہ دن آیا کہ حاجی صاحب جیل سے چھوٹے، خدا بخش کو تاریخ معلوم تھی، وہ جیل تک انھیں لینے گیا، اور اپنے ساتھ لایا، حاجی صاحب نے آتے ہی، رخسانہ کو کلیجے سے لگا لیا، اور رونے لگے، رخسانہ کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی بارش شروع ہو گئی، بڑی دیر تک باپ بیٹی، رو رو کر، دل کا بوجھ ہلکا کرتے رہے، پھر حاجی صاحب نے رخسانہ سے پوچھا،

"تیرے پاس تو جو کچھ تھا، تو نے مقدمے میں لگا دیا، پھر تیرا کام کیسے چلا"

رخسانہ کو پتہ نہ چل جائے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اب پھر اسے رونا پڑے
ے خوشی بہت کم ملی تھی، رونا اس کے حصہ میں بہت زیادہ آیا تھا،
یہ سوچتے تھے، میں اگر روتے روتے بھی مرجاؤں تو کوئی حرج نہیں
لیکن یہ لڑکی کب تک روئے گی؟ اس کی ہنسی اور خوشی کے دن
کب آئیں گے؟ اس نے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے؟
یہ میری بھولی سی بچی کیسی کملا گئی ہے۔ میں نے اسے نازو نعم سے اسی
ے پرورش کیا تھا؟ کیا یہ پھولوں کی سیج پر اسی لیئے، پروان چڑھی
تھی؟ کیا اس نے دولت کی گود میں اسی لیے آنکھیں کھولی تھیں؟
کیا ایسا نہیں ہو سکتا، اس کی ساری بدنصیبی مجھے مل جائے؟

درحقیقت، رخسانہ کا مستقبل، حاجی صاحب کے لیے سوہان روح
بنا ہوا تھا، اب وہ سوچنے لگے تھے، میں چراغ سحری ہوں، ہوا کا ایک
جھونکا آیا، اور بجھا، لیکن میرے بعد، میری بچی کیا کرے گی؟ وہ چاہتے
تھے، کوئی غریب، لیکن شریف آدمی مل جائے تو رخسانہ کا ہاتھ اس کے
ہاتھ میں پکڑا کر، اطمینان سے مرنے کی تیاری کریں، لیکن بظاہر ایسا
معلوم ہوتا تھا، موت آجائے گی، اور رخسانہ کے مستقبل کا کوئی انتظام
نہیں ہوگا، کوئی غریب بھی، مجھ غریب کی لڑکی قبول کرنے پر مشکل سے
تیار ہوگا، غریب لڑکے بھی، شادی کے لیے امیر گھروں پر للچائی

کو ہوجاتا تھا، یہ رقم ایسی تھی، کہ تنگی ترشی سے نہیں اطمینان سے زندگی بسر ہونے لگی، بلکہ ڈیڑھ دو روپیہ روزانہ پس انداز بھی ہوجاتا تھا! جس دن حاجی صاحب کے ٹھیلے پر کسی سپاہی کی نظر پڑ جاتی تھی، اس دن البتہ نفع سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا! لیکن ایسا روز نہیں ہوتا تھا، ہفتہ میں ایک آدھ بار!

حاجی صاحب اسے بھول چکے تھے، کہ وہ کبھی دلّی کے اچھے اور بڑے تاجر تھے، خوش حال اور فارغ البال تھے، اب وہ اپنی موجودہ حالت پر قانع تھے، دن بھر ایک مزدور کی طرح کام کرتے تھے، صبح ۹-۱۰ بجے گھر سے ٹھیلے لے کر نکل جاتے، اور شام کے سات بجے تک اسے شہر کے مختلف کوچوں، اور سڑکوں کا گشت کراتے، بہت تھک جاتے تو کسی سایہ دار درخت کے نیچے ٹھیلہ کھڑا کر کے بیٹھ جاتے، پھر ستا کر اٹھتے، اور کمر ہمت باندھ کر چل پڑتے، یہی ان کا صبح شام کا مشغلہ تھا، یہی ان کا ذریعہ معاش تھا!

شام کو تھکے ماندے گھر آتے، مغرب کی نماز کبھی پڑھ کر آتے کبھی آ کر پڑھتے، کھانا تیار ملتا، اس سے فارغ ہو کر کچھ دیر زمانہ سے باتیں کرتے پھر عشا کی نماز پڑھنے، مسجد چلے جاتے، وہاں سے آتے، اور منہ ڈھانپ کر پڑ رہتے، کبھی ایسا ہوتا تھا کہ نیند فوراً آجاتی تھی، اور کبھی بہت دیر جاگتے رہتے، اور اس صورت میں اکثر روتے روتے ان کا تکیہ تر ہوجاتا تھا، رونے میں وہ بہت اخفا سے کام لیتے تھے کہیں

حسرتِ تعمیر

مولیدینا مسافر خانے کے صحن میں حاجی صاحب نے ٹاٹ کا جو گھر بنایا تھا، ہر لحاظ سے وہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت تھا، پھر مسافر خانہ کا منیجر الگ انھیں، پریشان کرتا رہتا تھا، وہ جلد از جلد ٹاٹ کے مکان سے گلو خلاصی چاہتے تھے، لیکن خدا کا ملنا آسان تھا، کراچی میں بغیر پگڑی کے مکان کا ملنا ناممکن تھا اور پگڑی دینے کے قابل اگر وہ ہوتے تو پھر رونا ہی کا ہے کا تھا؟ ٹاٹ کے مکان میں سب سے زیادہ تکلیف ایک تو موسم کی تھی، دوسرے بے پردگی کی تھی، وہ رخسانہ کو چشم مردم سے نہاں رکھنا چاہتے تھے، لیکن اس گھروندے میں رہ کر کسی طرح بھی پردہ سلامت نہیں رکھا جا سکتا تھا،

ایک روز وہ بنس روڈ کی طرف سے گزر رہے تھے کہ ان کا

ہوئی نظر ڈالتے ہیں، وہ چاہتے ہیں غربت اپنے دست بازو سے نہیں، بیوی کی دولت و حشمت سے دور کریں، پھر کیا ہوگا؟ پھر رخسانہ کیا کرے گی؟ کیا ساری عمر اسے یونہی بسر کرنا پڑے گی؟

"آنا ہے تو ابھی آجاؤ، تالا مجھ سے لو، لگا کر جاؤ، فوراً سامان
[…]ے آؤ، ورنہ کسی کی نظر پڑی اور قبضہ ہوا!"

"اور الاٹمنٹ؟"

"یار حاجی صاحب، تم بھی نرے وہ ہو —— ابھی سے الاٹمنٹ
[…] فکر ہو گئی —— الاٹمنٹ تو ملنے سے رہا، آتے ہو تو آجاؤ!"

"کیوں الاٹمنٹ کیوں نہیں ملے گا؟"

"[…]ر وصاحب کی گورنمنٹ نے "بینک بیلنس" کی شرط لگادی ہے
[…]ٹ اسی کو ملے گا، جس کا بینک میں کافی روپیہ جمع ہو!"

حاجی صاحب بے بسی سے بولے،

"لیکن میرے پاس روپیہ کہاں؟"

رحمت نے کہا،

"ہزاروں آدمی بغیر الاٹمنٹ کے مکانوں پر قبضہ کیے ہوئے
—— فلسفہ بگھارو گے تو یونہی رہ جاؤ گے، جاتے ہو
[…]ن لانے یا نہیں؟ دوں تالا؟"

حاجی صاحب ڈرتے ڈرتے بولے،

"لاؤ!"

رحمت اپنے گھر سے تالا لایا، پہلے اس نے انھیں قلبیٹ دکھایا،
[…]ا تھا، پھر بند کر کے کنجی ان کے حوالے کی، اور کہا،

"بس اب فوراً نو دو گیارہ ہو جاؤ، دیر نہ کرو!"

ایک شناسا رحمت مل گیا، وہ اصرار کرکے حاجی صاحب کو اپنے مکان لے گیا، وہ لب سڑک ایک بلڈنگ میں رہتا تھا، یہ بہت بڑی عمارت تھی، اس میں تین کمروں کے کئی فلیٹ تھے، پہلے اس بلڈنگ میں سب ہندو ہی رہتے تھے، لیکن جب وہ کراچی سے رخصت ہو گئے، تو اس پر مہاجرین نے قبضہ کر لیا، رحمت کے فلیٹ سے ملا ہوا، ایک فلیٹ تھا لیکن ویران اور سنسان نظر آرہا تھا، حاجی صاحب نے پوچھا،

"اس میں کوئی نہیں رہتا؟"

رحمت نے جواب دیا،

"نہیں خالی ہے!"

پھر وہ بولا،

اس فلیٹ میں ایک ہندو رہتا تھا، ۶ رجنوری کے فساد کے بعد تالا ڈال کر، شکار پور چلا گیا تھا، آج آیا، اور اپنا سامان لے کر خیریت سے پاکستان کو، گالیاں دیتا ہوا چلا گیا!"

"کیوں؟ اس نے پگڑی نہیں لی؟"

"لیتا تو، مگر لے نہیں سکا،

"کیوں؟"

"بات یہ ہوئی کہ حضرت پر ایک مقدمہ چل گیا تھا، لہٰذا چپ چپاتے چلے گئے! ——— تم آجاؤ نہ یہاں؟"

"میں آجاؤں؟"

ٹوکر، دیکھ آتے تھے، کہیں کوئی کھول تو نہیں لے گیا، یہاں آکر اس
ے بھی بے فکر ہوگئی،
رحمت نے کہا تھا اس فلیٹ کا کرایہ ۲۵ روپیہ ماہوار ہے، یہ
ب حاجی صاحب کے لیے کچھ بہت زیادہ نہیں تھی، کیونکہ رخسانہ
سلائی، اور ٹھیلہ کے گشت سے، مجموعی آمدنی، سوا سو ڈیڑھ سو کے قریب
وجاتی تھی لیکن چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ۲۵ روپیہ کرایہ بھی نہیں
ناپڑے گا، کیونکہ بلڈنگ کے مالک کا گماشتہ بھی ہندوستان چلا گیا
ے اور اب کوئی کرایہ وصول کرنے والا نہیں ہے!

کوئی چار مہینے تک حاجی صاحب اطمینان سے اس مکان میں رہے،
بڑے اطمینان سے رہے، ایک روز جب وہ بازار سے واپس
ئے، تو انھوں نے دیکھا، دروازہ پر ایک نوٹس لگا ہے، پڑھا تو لکھا
تھا،

"حاجی عبدالستار نے اس مکان پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے،
لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر، یہ مکان خالی
کر دیا جائے ورنہ ضابطہ کارروائی عمل میں آئے گی!"

یہ نوٹس پڑھ کر حاجی صاحب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی،
یدے، وہ رحمت کے پاس پہنچے، اور یہ سارا ماجرا بتایا، رحمت نے
یک قہقہہ لگایا۔

"ایسے تماشے روز ہوتے رہتے ہیں، تم پروا کیوں کرتے ہو، لیکن

حاجی صاحب سیدھے، مولیدینا مسافرخانے پہنچے، رخسانہ کچھ پ
رہی تھی، اس سے کہا،

"اٹھو بیٹی چلو!"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی،

"کہاں ابّا جان؟"

"مکان مل گیا ہے، اچھا خاصا ہے!"

رخسانہ بہت خوش ہوئی، فوراً اس نے اپنا مختصر سا سامان سنبھ
اتنے میں حاجی صاحب وکٹوریہ لے آئے، دونوں اس پہ بیٹھ کر جس
کی "گدڑوالی بلڈنگ" کی طرف روانہ ہوگئے،

رخسانہ اس نئے مکان میں آکر، بہت مسرور ہوئی، دلی
بچھڑنے کے بعد سے آج پہلی مرتبہ اسے مکان ملا تھا جس میں تین
تھے، باورچی خانہ تھا، غسل خانہ تھا، اسٹور روم تھا، اور سب
کر یہ کہ الگ تھلگ تھا، نہ کوئی تاک جھانک کرسکتا تھا نہ
کا اندیشہ تھا، جلدی جلدی اس نے گھر کی صفائی کا کام شروع کر
ڈیڑھ دو گھنٹے میں آئینہ کی طرح جھک کردیا، اپنا مختصر سا غریبانہ سا
سلیقہ سے سنبھال کر لگا دیا اور باپ بیٹی دونوں نماز شکرانہ پڑھنے
کھڑے ہوگئے، حاجی صاحب کو ایک سہولت یہ بھی مل گئی کہ اپنا
وہ بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں رکھنے لگے، مولیدینا مسافرخانے میں
دروازہ کے پاس رکھ کر اندر چلے آتے تھے، اور رات میں کئی

پھر سوال ہوا،

"سرمایہ کتنا ہے؟"

مجرم نے کہا،

"دو ڈھائی سو روپے ہوں گے، لیکن بنک میں نہیں ہیں یہ روپے!"

حاجی صاحب نے صدری میں ہاتھ ڈال کر دو، ایک، پانچ، دس روپے کے نوٹ نکالے، رنٹ کنٹرولر نے کہا،

"اس کی ضرورت نہیں ———— یہ مکان الاٹ ہو چکا!"

جیب میں اپنی حقیر پونجی رکھتے ہوئے حاجی صاحب نے کہا،

"خدا اجر دے گا، اس احسان کا حضور کو ———— جوان اور کنواری بچی کو سر چھپانے کی جگہ مل گئی، وہ بھی دعا دے گی، حضور کو!"

حاجی صاحب باہر آئے، اور خوشی خوشی کلرک کے پاس الاٹمنٹ لینے پہنچے، اس نے کہا،

"کیسا الاٹمنٹ؟ آپ جس مکان میں رہتے ہیں، وہ تو حاجی عبدالغفار گھڑی والے کو الاٹ ہو چکا ہے!"

حاجی ستار، سرد پڑ گئے، بڑی مریل آواز میں پوچھا،

"حاجی عبدالغفار گھڑی والے؟"

کلرک نے کہا،

"جناب!"

اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا، حاجی صاحب بدستور کھڑے

اب ایک کام کرو!"

حاجی صاحب نے پوچھا،

"وہ کیا؟"

رحمت بولا،

"الاٹمنٹ کی درخواست دے دو!"

"دے تو دوں، لیکن روپیہ کہاں سے لاؤں، بینک بیلنس دکھانے کے لیے!"

رحمت نے کہا،

"درخواست دے دو، اب یہ قاعدہ نرم کر دیا گیا ہے، پھر بینک بیلنس کے بغیر بھی کام چل جائے گا!"

حاجی صاحب نے فوراً، ایک درخواست ٹائپ کرائی، اور ریذیڈنٹ کنٹرولر کے آفس پہنچے، وہاں سیکڑوں آدمی اس سلسلہ میں موجود تھے، عجب شہر ناپُرساں نظر آتا تھا، جہاں کوئی کسی کا پرسان حال نہیں تھا۔

بڑی دیر کے بعد، حاجی صاحب کی باری آئی، کلرک نے درخواست لے لی، اور تیسرے دن کی تاریخ دے دی، تیسرے دن پہنچے، تو ریذیڈنٹ کنٹرولر بہادر کے اجلاس فرخندہ بنیاد پر پیشی ہوئی، سوال کیا گیا،

"کیا کرتے ہو؟"

ملزم نے کہا،

"سوداگری!"

حاجی صاحب نے پوچھا،

"کیوں؟"

رحمت بولا،

"حاجی عبدالغفار بہت بڑے آدمی ہیں، بڑے اثر و رسوخ والے جہاں جب چاہیں پہنچ جائیں، یہ مکان اگر انھیں الاٹ ہو چکا ہے، تو مر بھی جاؤ، تو اسے نہیں پا سکتے تم! سمجھے!"

"ہاں سمجھ گیا!"

گھر آ کر ریحانہ کو، حاجی صاحب نے ساری رام کہانی سنائی، وہ رونے لگی، اس کی آنکھوں کے سامنے، والٹن کیمپ، جہانگیر کا مقبرہ اور مولیدینا کا مسافر خانہ پھر گیا،

اس نے کہا،

"اب؟ اب کیا کریں؟"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے،

"کیا بتاؤں بیٹی! ــــــــ معلوم ہوتا ہے، ستارہ اب تک گردش میں ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے؟"

دو دن پلک جھپکاتے میں گذر گئے، تیسرے دن حاجی عبدالغفار گھڑی والے پولیس کو لے کر پہنچ گئے، انسپکٹر پولیس نے کہا،

"مکان خالی کر دیجیے!"

حاجی صاحب نے کہا،

حاجی صاحب نے پوچھا،

"کیوں؟"

رحمت بولا۔

"حاجی عبدالغفار بہت بڑے آدمی ہیں، بڑے اثر و رسوخ والے جہاں جب چاہیں پہنچ جائیں، یہ مکان اگر انھیں الاٹ ہو چکا ہے، تو مر بھی جاؤ، تو اسے نہیں پا سکتے تم! سمجھے!"

"ہاں سمجھ گیا!"

گھر آ کر رخسانہ کو، حاجی صاحب نے ساری رام کہانی سنائی، وہ رونے لگی، اس کی آنکھوں کے سامنے، والٹن کیمپ، جہانگیر کا مقبرہ اور مولیدینا کا مسافر خانہ پھر گیا،

اس نے کہا،

"اب؟ اب کیا کریں؟"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے،

"کیا بتاؤں بیٹی! ———— معلوم ہوتا ہے، ستارہ اب تک گردش میں ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے؟"

دو دن پلک جھپکتے میں گذر گئے، تیسرے دن حاجی عبدالغفار گھڑی والے پولیس کو لے کر پہنچ گئے، انسپکٹر پولیس نے کہا،

"مکان خالی کر دیجیے!"

حاجی صاحب نے کہا،

سب سے پہلے حاجی صاحب، پھر مولیدینا مسافر خلنے پہنچے، لیکن منیجر نے انھیں اندر بھی نہیں گھسنے دیا، اس نے کہا،

"بس معاف کرو، ٹھنڈے ٹھنڈے چلے جاؤ!"

یہاں سے وہ رخسانہ کی انگلی پکڑ کر، حاجی کیمپ پہنچے، یہاں ہزاروں پہلے سے بسے ہوئے تھے، یہاں سے بھی صاف جواب ملا،

"افسوس ہے یہاں اب ایک آدمی کی بھی گنجائش نہیں!"

حاجی کیمپ کے بارے میں حاجی صاحب کو امید تھی، ضرور جگہ مل جائے گی، لیکن یہاں بھی، مایوسی ہوئی، اب کہاں جائیں؟ جی چاہا، کیماڑی جائیں، رخسانہ کو سمندر میں دھکیل کر خود بھی کود پڑیں، لیکن وہ رخسانہ کے صرف باپ ہی نہیں تھے، ماں بھی تھے، کس دل سے رخسانہ کی جان لیتے، اسی کے لیے تو مر مر کر جی رہے تھے،

شہر کے ایک گوشہ میں، بہت سے لوگ ٹاٹ کے مکانوں میں رہ رہے تھے، یہاں آئے، اور ایک جگہ منتخب کر کے بیٹھ رہے، رخسانہ سمجھ گئی، اب حاجی صاحب ٹاٹ خریدنے جانے والے ہیں، اور واقعی حاجی صاحب نے کہا،

"تم یہیں بیٹھو، میں ٹاٹ اور بانس لے کر آتا ہوں، یہیں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنالیں گے!"

وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی، اور حاجی صاحب ——— وہ جو رکھتے تھے، ہم اک حسرت تعمیر سو ہے! ——— کا پیکر مجسم بنے ہوئے

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، ابھی لیجئے"

وہ اندر گئے، رخسانہ سے کہا،

"بیٹی، حکم آگیا، چلو!"

رخسانہ سمجھی نہیں کیا کہہ رہے ہیں؟ اس نے پوچھا،

"کہاں چلیئے گا، کس کا حکم آگیا!"

حاجی صاحب نے جواب دیا،

"پولیس آگئی ہے، چپ چاپ چلی چلو، ورنہ تمھارا بوڑھا باپ جیل میں ہوگا، اور اس میں اب جیل جانے کی سکت نہیں ہے اب اگر گیا، تو مر کر آئے گا وہاں سے!"

رخسانہ جیل کا نام سنتے ہی لرز گئی، اس نے کہا،

"چلیئے!"

پھر اس نے، اپنا مختصر سا سامان اٹھایا، اور اس گھر پر الوداعی نظر ڈالتی ہوئی جس میں چار مہینے سکھ اور آرام سے رہی تھی، باہر نکل آئی،

جب دو آدمیوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ اپنا سامان بغل میں دبائے باہر نکل رہا تھا، حاجی عبدالغفار کے آدمی، اونٹ گاڑی سے ان کا سامان اتار اتار کر اندر جا رہے تھے، کوئی مسرور تھا، کوئی رنجور، دنیا کی ریت یہی ہے، ایک کی بربادی، دوسرے کی آبادی، ایک کی آبادی دوسرے کی بربادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، یہ دنیا کا بہت پرانا قاعدہ ہے اور اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں،

باب ۱۸

ایک اور مصیبت

رخسانہ، بہت خفا تھی، اسے حکومت کے کارندوں پر بہت غصہ تھا اب تک ہر تکلیف اور مصیبت وہ سہتی آئی تھی، لیکن یہ ذلت نہ برداشت کر سکی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہوگئی، کھانا پینا بے مزہ ہونے لگا، وہ دل ہی دل میں سوال کرتی تھی، حاجی عبدالغفار میں کون سے لعل جڑے تھے کہ انھیں مکان دے دیا گیا، اور ہم ایسے کہاں کے گئے گزرے تھے، کہ ہم سے چھین لیا گیا، جن باتوں میں حکومت بے بس ہے مجبور ہے، خیر، مگر کیا، انصاف کرنے میں بھی وہ بے بس ہے؟ عمل کرنے میں بھی وہ مجبور ہے؟ ہم پہلے آئے تھے، ہمارا حق پہلے تھا پھر ہمیں اجاڑ کر دوسرے کو کیوں بسایا گیا؟

اسی غم و غصہ کے عالم میں وہ بیٹھی تھی کہ حاجی صاحب نماز پڑھ کر

بازار روانہ ہو گئے، پہلے وہ ایک بہترین کوٹھی کے مالک تھے، اب وہ ایک ٹاٹ کے مکان کے لیے مارے مارے پھر رہے تھے،

دو تین دن میں، ایک چھوٹا سا مکان بن گیا، وہی ٹاٹ کا مکان جس پر چونے کی استر کاری کی ہوئی تھی، اور، یہ دونوں پھر اطمینان اور خاموشی سے اس مکان میں رہنے لگے، جیسے ان کے پاس سے کوئی چیز چھنی ہی نہیں، جیسے، انھیں کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچی ہی نہیں!

کچھ دن وہاں رہے، پھر واپس آ گئے، اپنی جگہ!"

وہ روتی ہوئی بولی،

"لیکن ہم جو گھر سے بے گھر ہوئے؟ ہمارے مکان پر جو دوسروں کا قبضہ ہے؟"

حاجی صاحب نے کہا،

"ٹھیک ہے، لیکن ہم نے اپنا مکان اس لیے نہیں چھوڑا کہ ہم ناجائز طور پر کسی اور کے مکان پر قبضہ کر لیں۔ ہم نے یہ مصیبت خدا کے لیے جھیلی ہے، وہی ہمیں اس کا اجر دے گا، ہم اپنا اجر ہاشم رضا، یا شہاب الدین سے نہیں چاہتے، یہ اگر دیں بھی تو ہمارا وہ حق مارا جائے گا، جو خدا پر قائم ہو چکا ہے!"

رخسانہ نے کوئی جواب نہیں دیا، اور حاجی صاحب نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا، انھوں نے کہا،

"بیٹی، ایک بات یاد رکھو، اگر ہم نے غم سہنے کی عادت نہ ڈالی اگر ہم نے مصیبتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہ پیدا کیا، تو ہم نے کچھ دکیا، ہم پھر، اپنی آزادی بھی قائم نہیں رکھ سکیں گے!"

وہ جھلا کے بولی،

"تو رہیے یہاں، میں کب منع کرتی ہوں!"

انھی باتوں کے دوران میں، بڑے زور سے گھٹا گھر کر آئی معلوم ہوتا تھا، بارش اب ہوئی، اور اب ہوئی، آسمان کی طرف دیکھ کر

آئے، ایک نظر رخسانہ پر ڈالی، اور کہا،
"بیٹی، تو اب تک مکان کا سوگ منائے جا رہی ہے؟"
وہ بولی،
"ہاں ابا، مجھے بہت صدمہ ہے، اور صدمہ آپ کی کمزوری پر زیادہ ہے!"
"میری کمزوری؟"
"ہاں ابا! ــــ یہ مکان ہمیں نہیں چھوڑنا چاہیئے تھا"
"تو کیا پولیس سے لڑتے؟"
"لڑنے کی بھی ضرورت نہیں تھی، اڑ جاتے، چاہے کچھ ہو جاتا، گھر سے نہ نکلتے، اور اگر نکلتے تو مر کر، جان دے کر!"
حاجی صاحب نے بہت زیادہ ملاطفت اور غمگین تبسم کے ساتھ کہا،
"ہماری بیٹی، آج جلال میں ہے!"
رخسانہ بولی،
"یہ بات تو نہیں ــــــــ لیکن واقعی مجھے صدمہ ضرور ہے!"
"لیکن میری بچی کس بات کا!"
"مکان چھوڑنے کا!"
حاجی صاحب ذرا تیز ہو کر بولے،
"کیوں؟ ــــ کیا وہ مکان ہمارا تھا؟ آخر اس پر ہمارا کیا حق تھا؟ ہم نے ایک غیر کے مکان پر قبضہ کیا تھا، وہاں سے نکلنے کا ہم غم کیوں کریں؟ سمجھ لو، اپنے ٹاٹ کے گھر سے کہیں مہاں گئے تھے

کھڑے کھڑے گزار دی، جب کپڑے بالکل بھیگ جاتے تھے، تو کھڑے کھڑے اور پہنے پہنے نچوڑ لیتے تھے، تھوڑی دیر میں پھر وہی حالت ہو جاتی تھی، اور پھر نچوڑنے لگتے تھے،

صبح کو حاجی صاحب نے کہا:

" اب نماز کو کس طرح جاؤں؟ "

رخسانہ نے کہا،

" نماز کے لیے تو کسی نہ کسی طرح مسجد تک جانا ہی پڑے گا، یہاں تو سجدہ کرنے کی بھی جگہ نہیں!

بارش اب تک ہو رہی تھی، حاجی صاحب بھیگتے ہوئے مسجد پہنچے، یہاں جل تُوں کر کے نماز پڑھی، اور پھر بھیگتے ہوئے واپس آ گئے، بیٹی سے کہا،

" آج پکانا ریندھنا تو ہو نہیں سکتا، لاؤ ہوٹل سے چائے اور نان پاؤ لے آؤں، کچھ گرمی تو آئے بدن میں!"

رخسانہ نے آٹھ آنے پیسے حاجی صاحب کے ہاتھ پر رکھے، اور وہ ہوٹل سے چائے، اور پاؤ لے آئے، دونوں نے کھڑے کھڑے ناشتہ کیا، یہ گرم گرم چائے پی رہے تھے اور اوپر سے اولے کی طرح ٹھنڈا پانی برس رہا تھا،

کوئی دس بجے کے قریب بارش رکی اور دھوپ نکلی، لیکن عارضی طور پر کبھی مینہ برسنے لگتا، کبھی دھوپ نکل آتی، سارا دن اسی طرح گزر گیا، ساری رات بھی اسی طرح گزر گئی۔ جب کپڑے خشک ہونے

رخسانہ نے کہا،

"بڑے زور سے بارش ہونے والی ہے!"

حاجی صاحب نے تائید کی،

"ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے!"

وہ بولی،

"اب آئے گا مزا بھیگنے میں!"

حاجی صاحب نے بڑے عزم واستقلال کے ساتھ کہا،

"ہاں بیٹی، ہم اس تکلیف کو اسی طرح برداشت کریں گے، جس طرح، لوگ راحت، اور آرام کی گھڑیاں کاٹتے ہیں!"

اور واقعی دفعتہً بڑی گھن گرج کے ساتھ، بارش ہونے لگی، پہلے چھوٹی چھوٹی بوندیں ٹپکیں، پھر تو تار بندھ گیا ٹاٹ کے پردے اس طوفانی بارش کو کیا روکتے؟ پانی باقاعدہ اندر آرہا تھا، رخسانہ اور حاجی صاحب مکمل طور پر بھیگ رہے تھے، سڑکوں، اور گلیوں کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ تو ہوئی ہوگی، لیکن حاجی کے ٹاٹ خانے میں تو واقعی جل تھل ہو رہا تھا، کہیں پناہ کی جگہ نہیں تھی، پہلے کیچڑ ہوا پھر گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر گیا، پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہیں تھا، جو کپڑے تن پر تھے، وہ تو شرابور ہوئے ہی، لیکن جو کپڑے بکس میں تھے، وہ بھی سلامت نہ رہے، رات بھر موسلا دھار بارش ہوتی رہی، بیٹھنے اور لیٹنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، ساری رات دونوں نے

سنبھالے نہ سنبھلتے تھے، اب رخسانہ نے خبرگیری کے ساتھ ساتھ رونا بھی شروع کر دیا، لیکن رونے سے بوڑھے اور بیمار باپ کی مصیبت کم نہیں ہوئی، بڑھتی ہی گئی، کچھ اضافہ ہی ہوتا گیا!

کوئی ۹ بجے کے قریب حاجی صاحب پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی رخسانہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، پاس ہی ایک ڈاکٹر کی دوکان تھی، اس نے حاجی صاحب کو اسی حالت میں چھوڑا، اور برقعہ اوڑھ کر فوراً وہاں پہنچی، حاجی صاحب کا حال بیان کیا، اور ڈاکٹر صاحب کو فیس دے کر اپنے ہمراہ لائی،

ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے حاجی صاحب کا معائنہ کیا، آخر فیس لے چکے تھے، کچھ تو اس کا حق ادا کرتے، پھر اور زیادہ اطمینان کے ساتھ کہا،

"انھیں نمونیہ ہے!"

رخسانہ یہ سنکر زرد پڑ گئی، ڈاکٹر صاحب بولے،

"بوڑھے آدمی ہیں، سردی کی اور بھیگنے کی تاب نہ لا سکے، ڈبل نمونیہ ہوگیا ہے، انھیں!"

ڈبل نمونیہ کا نام سنکر وہ اور زیادہ پریشان ہوئی، اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا، پوچھا،

"کیا کہا آپ نے؟"

ڈاکٹر صاحب نے جانے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا،

"انھیں ڈبل نمونیہ ہوگیا ہے، جلد توجہ کیجیے، ورنہ زندگی خطرہ میں ہے"

کے قریب ہوتے پھر بارش ہونے لگتی، جب بھیگ جاتے پھر دھوپ نکل آتی، معلوم ہوتا تھا، موسم ان لوگوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے،

تقریباً تین روز تک یہی کیفیت رہی، حاجی صاحب، اور رخسانہ، خاموشی کے ساتھ دکھ سہتے رہے، رخسانہ تو اس طوفان سے صحیح سلامت نکل آئی، لیکن حاجی صاحب کا بوڑھا جسم، اس طوفان کے ریلے کو در سہ سکا، وہ عشا کی نماز پڑھ کر مسجد سے کراہتے ہوئے آئے، اور اپنے گیلے بستر پر، دراز ہو گئے، رخسانہ نے پوچھا،

"ابا کیا بات ہے؟"

"بدن ٹوٹ رہا ہے بیٹا!"

رخسانہ نے پنڈے پر ہاتھ رکھا تو وہ آگ کی طرح دہک رہا تھا، اس نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا، اور کہا،

"ارے آپکو تو بخار ہے!"

"ہاں! ———— لیکن اب اس وقت کیا ہو سکتا ہے، اتنی رات گزر گئی، صبح کو حکیم صاحب کے پاس جاؤں گا!"

حاجی صاحب رات بھر کراہتے رہے، ان کا بخار کم ہونے کے بجائے بڑھتا رہا، رخسانہ ان کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی، وہ بار بار —— پانی گرم کرکے چائے بناتی تھی، اور پلاتی تھی، صبح ہوتے ہوتے سینے کی درد کی شکایت انھوں نے کی، پھر، درد بڑھا کر ناقابل برداشت ہو گیا، وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگے، رخسانہ لاکھ لاکھ انھیں سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی، لیکن وہ اس کے

"بیٹی، آدمی، آدمی کے کام آتا ہے، اس کام کی بھلا میں مزدوری لوں گا؟ چلو!"

وکٹوریہ والا اگرچہ بوڑھا تھا، لیکن ٹانٹھا تھا، اس نے رخسانہ کی مدد کی، حاجی صاحب کے کمزور جسم کو، گود میں اٹھایا، اور لاکر، وکٹوریہ کی سیٹ پر لٹا دیا، رخسانہ باپ کے پاس آکر بیٹھ گئی،

ہسپتال تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، وکٹوریہ والے نے بہت ساتھ دیا، وہ رخسانہ کے ساتھ ساتھ جنرل وارڈ میں پہنچا، وہاں حاجی صاحب کی حالت بیان کی، اسے بتایا گیا، یہاں نہیں، فلاں وارڈ میں مریض کو لے جاؤ، وہ حاجی صاحب کو گود میں لیے لیے وہاں پہنچا، یہاں پہنچکر معلوم ہوا، یہ جگہ بھی ٹھیک نہیں ہے، پھر اشارہ سے ایک دوسرا وارڈ بتایا گیا، یہاں ہانپتا ہوا پہنچا، وہ بھی بوڑھا تھا، کہاں تک جواں ہمتی دکھاتا،

اس وارڈ میں پہنچکر، بتایا گیا،

"ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر میں آئیں گے!"

حاجی صاحب نیم مُردہ پڑے تھے، وکٹوریہ والے نے کہا،

"بیٹی، غریب آدمی ہوں، ابھی بالکل مزدوری نہیں کی، اب تم ڈاکٹر صاحب سے کہہ لینا حال، میں جاتا ہوں!"

رخسانہ نے دو روپے، اس کے ہاتھ پر رکھے، وہ دعا دیتا ہوا چلا گیا

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد، بڑے کروفر سے کئی نرسوں کے جلو میں

اس نے چیخ کر کہا،

"زندگی خطرہ میں ہے؟"

"ہاں!"

"پھر میں کیا کروں؟ بتائیے، کوئی نسخہ لکھ دیجیے!"

وہ باہر نکلتے ہوئے ایک نظر مریض پر، اور ایک تیماردار پر ڈال کر جلدی سے بولے،

"میرے نسخہ سے کام نہیں چلے گا!"

بڑی بے بسی کے ساتھ اس نے پوچھا،

"پھر؟"

"ہسپتال لے جائیے فوراً بڑا سیریس کیس ہے!"

ڈاکٹر چلے گئے، اور رخسانہ سوچنے لگی، اب کیا ہو؟ کون ہے مدد کرے، اور ہسپتال میں پہنچا دے؟ پھر اس نے سوچا، اب رونے دھونے میں زیادہ وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھی، جلدی سے ایک وکٹوریہ کر کے لائی، وکٹوریہ والا ایک بوڑھا آدمی تھا، اس سے کہا،

"بابا، میرے ابا بیہوش پڑے ہیں، انھیں ڈبل نمونیہ ہو گیا ہے، تم میری مدد کرو، چلو ہم تم دونوں انھیں اس پر لٹائیں، پھر ہسپتال لے چلو میں تمھیں کچھ زیادہ دے دوں گی!"

وکٹوریہ والے نے کہا،

ی نے تو انھیں بیمار ڈالا ہے!"

وہ رونے لگی، کبھی کبھی پتھر میں جونک لگ جاتی ہے، ڈاکٹر صاحب

ذرا پیجیے، انھوں نے نرس سے کہا،

"انتظام کرو!"

نرس کے ہاتھ میں جیسے علاؤ الدین کا چراغ تھا، فوراً انتظام ہوگیا

ور حاجی صاحب، ہسپتال کے مہمان بن گئے، رخسانہ نے پوچھا،

کیا میں ابا کے پاس رہ سکتی ہوں؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا،

"نہیں! ——"

وہ رونے لگی،

ڈاکٹر صاحب نے کہا،

"ہم اپنے قاعدہ سے مجبور ہیں: تم دن میں دو دفعہ دیکھنے آسکتی ہو!"

پھر اسے روتا دیکھ کر کہا،

"گھبراؤ نہیں، ہم پوری کوشش کریں گے کہ یہ اچھے ہو جائیں لیکن

زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے:"

رخسانہ نے پھر التجا کی،

"مجھے یہاں رہنے دیجیے، ڈاکٹر صاحب بہت احسان مانوں گی!"

ڈاکٹر صاحب نے کہا،

"تم مطمئن رہو یہاں ان کی تیمارداری گھر سے اچھی ہوگی، تم صبح

ڈاکٹر صاحب آئے، رخسانہ لپک کر ان کے پاس پہنچی،

"میرے بابا کو دیکھ لیجیے، ان کی حالت بہت نازک ہے!"

ڈاکٹر صاحب رخسانہ کو تو نہ دیکھ سکے، کیونکہ وہ برقع میں لپٹی ہوئی تھی، لیکن اس کی آواز کو انھوں نے دیکھ لیا، مریض کے پاس آئے، اسے ٹٹولا، دیکھا بھالا، اور وہی رائے انھوں نے بھی ظاہر کر دی، جو گھر والے ڈاکٹر نے کہا تھا، یعنی ڈبل نمونیہ، رخسانہ نے عاجزی کے لہجہ میں کہا،

"تو انھیں یہاں داخل کر لیجیے!"

ڈاکٹر صاحب نے کہا،

"لیکن ہمارے پاس کوئی بستر خالی نہیں ہے!"

وہ بولی،

"بستر میں لے آؤں گی گھر سے!"

وہ ہنستے ہنستے کہنے لگے،

"بستر نہیں، چارپائی! ——— چارپائی خالی نہیں ہے!"

نرس نے کہا،

"مریض بہت ہیں!"

رخسانہ بولی،

"تو انھیں زمین پر لٹا دیجیے، میں غریب عورت ہوں، گھر پر علاج نہیں کر سکتی، اور میرے پاس گھر بھی تو نہیں ——— جو گھر ہے

لہذا، وہ اسے خریدنا پڑتے تھے، آنے جانے میں بھی خرچ ہوتا تھا،
"اگرچہ ڈاکٹر، تندہی سے حاجی صاحب کا علاج کر رہا تھا، لیکن انکی
طبیعت ایک مرتبہ جو گری تو پھر نہیں سنبھلی، کبھی وہ ہوش میں آجاتے تھے،
کبھی پھر بیہوش ہوجاتے تھے، ایک روز رخسانہ نے ڈاکٹر سے پوچھا،
"ڈاکٹر صاحب ابا کا کیا حال ہے؟"
وہ سر کھجاتے ہوئے بولے،
"اچھا ہے؟"

وہ بولی،
"مجھ سے کچھ چھپائیے نہیں، میں ہر خبر کے سننے کے لیے تیار ہوں اور
ہر غم سہہ سکتی ہوں، صاف صاف بتا دیجیے، شکر گزار ہوں گی!"
ڈاکٹر نے جواب دیا،
"کوشش میں اب بھی کر رہا ہوں، اور آخر وقت تک کرتا رہوں گا
لیکن"
"لیکن کیا؟ کہئے؟ ——— کہئے!"
ڈاکٹر نے کہا،
"حالت کافی خطرناک ہے، خدا ہی ہے جو بچیں ——— کمزوری
کسی طرح نہیں دور ہوتی، اور پھیپھڑے بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں!"
بڑی مایوسی سے رخسانہ نے دریافت کیا،
"کیا بالکل امید نہیں ہے؟"

شام دیکھنے آجایا کرو، ان کے پاس رہنا تمھارے لیے بھی مضر ہے، اور ان کے لیے بھی ہوش میں آنے کے بعد، یہ تمھیں دیکھ کر رو دیں گے، تم انھیں دیکھ کر!"

تیمارداری کا خاص طور پر خیال رکھا جائے!"

نرس نے ادب سے اقرار میں گردن ہلا دی، ڈاکٹر صاحب اپنے کام میں لگ گئے، اور رخسانہ، باحال زار، اشکبار و دلفگار اپنے کمرے میں واپس آگئی، آج اس کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا، سلائی کا بہت سا کام پڑا ہوا تھا، لیکن اس نے، نظر اٹھا کر بھی مشین اور کام کی طرف نہیں دیکھا، وضو کر کے مصلّے پر بیٹھ گئی!

نماز! اور دعا!

بس یہی دو کام تھے، جن میں پورے خضوع اور خشوع سے وہ لگی ہوئی تھی، اس کا عقیدہ تھا، دوا میں وہ اثر نہیں ہے، جو دعا میں ہے، اور وہ بھی اس دعا میں جو دل سے نکلی ہو،

اب رخسانہ کا یہ معمول ہو گیا کہ وقت کا بڑا حصّہ وہ نماز اور دعا میں صرف کرتی، پابندی کے ساتھ دن میں دو مرتبہ ہسپتال جاتی، اور اس سے جو وقت بچتا، وہ سلائی کے کام میں صرف کرتی، اس لیے کہ اسی آمدنی پہ، اب گھر کے خرچ کا دار و مدار تھا، حاجی صاحب کا ٹھیلہ بیکار پڑا تھا، اور ہسپتال میں، اگرچہ حاجی صاحب کا علاج مفت میں ہو رہا تھا، پھر بھی انجکشن وغیرہ ہسپتال اپنے پاس سے نہیں لگا سکتا تھا

ابا کی حالت لمحہ بہ لمحہ مایوس کن ہوتی جا رہی تھی، جیسے وہ فیصلہ کر چکے تھے، کہ اب زندہ نہیں رہیں گے، موت سے معانقہ کر کے رہیں گے!
حاجی صاحب کی تیمارداری تو ہسپتال کا اسٹاف کر رہا تھا، اور اچھی طرح کر رہا تھا، کم از کم رخسانہ کو کوئی شکایت نہیں تھی، لیکن دوا، اور دعا کے باوجود وہ اچھے کیوں نہیں ہوتے؟ ڈاکٹر ان کی زندگی کی آس کیوں نہیں دلاتا، یہ سوچ کر وہ رونے لگتی تھی، باپ کی تکلیف اس سے نہیں دیکھی جاتی تھی، وہ ہر معاملہ میں صبر کر سکتی تھی، لیکن باپ کے معاملہ میں نہیں،

آج وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر گئی، کئی دن ہو چکے تھے، وہ گھر نہیں جا سکی تھی، آج اس نے سوچا ذرا گھر ہو آئے، سلائی کے کپڑے واپس کر آئے، کیونکہ جب تک حاجی صاحب اچھے نہ ہو جائیں، وہ کوئی کام نہیں کر سکتی تھی، کسی کام میں اس کا جی نہیں لگ سکتا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ جلد واپس آجائے گی، لیکن کپڑے واپس کرنے کا کام آسان نہ تھا، کئی جگہوں پر جانا تھا، معذرت کرنی تھی،

دوپہر کو وہ آئی تھی، اور مغرب کے بعد اس کام سے فارغ ہوئی، جلدی جلدی ہسپتال کی طرف چلی، جب اپنے وارڈ میں پہنچی، تو اس نے دیکھا، حاجی صاحب کی چارپائی خالی ہے،

وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی، اور سوچنے لگی،

"ابا کہاں گئے؟ وہ تو ہل بھی نہیں سکتے تھے!"

وہ بولے،

"کیوں نہیں ہے؟ اسی لیے تو اب تک علاج سے ہاتھ نہیں اٹھایا لیکن میں پھر کہتا ہوں، امید کم ہے بہت کم!"

رخسانہ نے کہا،

"کم سے کم اب تو مجھے یہاں رہنے دیجیے! کیا آپ میری یہ درخواست اس مرتبہ بھی رد کر دیں گے؟"

رخسانہ رونے لگی، اور ڈاکٹر صاحب اس مرتبہ انکار نہ کر سکے، انھوں نے کہا،

"آپ رہ سکتی ہیں!"

پھر نرس سے مخاطب ہوئے،

"انھیں رہنے دو!"

نرس نے ایک ادا کے ساتھ اقرار میں گردن ہلائی، اور رخسانہ باپ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی، جیسے کوئی بہت بڑی دولت اور نعمت اس کے پاس ہے، اور اسے کوئی چھینے لیے جا رہا ہے، لوٹے لیے جا رہا ہے!

رخسانہ باپ کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی، اور اسے بالکل بھول چکی تھی کہ اس کا کوئی جھونپڑا ہے، اور اس جھونپڑی میں سینے کی سنگر مشین ہے اور اس مشین کے پاس لوگوں کے سلائی کے کپڑے ہیں، گھر کوئی لوٹ لے مشین کوئی لے جائے، کپڑے کوئی پار کر دے، اسے اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی، اسے اگر فکر تھی تو صرف یہ کہ ابا کسی طرح چنگے ہو جائیں

سب لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے، مریض ۱۲ کی جو چارپائی ابھی تھوڑی دیر پہلے خالی ہوئی تھی، وہ پھر آباد ہو گئی، نمبر بھی وہی تھا، چارپائی بھی وہی تھی، لیکن مریض بدل چکے تھے، ایک لاش خانہ میں ہمیشگی کی نیند سو رہا تھا، اور دوسرا، چارپائی پر موت سے کشتی لڑ رہا تھا، لاش خانہ میں ابھی ایسے ایسے کئی مریضوں کی جگہ تھی، لاش خانہ کا دل بہت وسیع تھا، اس کا دروازہ کسی کے لیے بند نہیں تھا، وہ ہر اس شخص کو پناہ دے سکتا تھا، جو مرنے کے بعد، اس کی پناہ کا طالب ہو!

حاجی عبدالستار ختم ہو گئے ——————

رخسانہ، موت کا انتظار کر رہی تھی! ——————

زندگی موت کے پیچھے دوڑ رہی تھی! ——————

——————

اتنے میں ایک عیسائی نرس پر اس کی نظر پڑی، اس نے کہا،
"مریض ع ۱۲ کہاں ہے؟"
وہ بے پروائی سے بولی،
"مر گیا!"
رخسانہ چیخ پڑی،
"مر گیا؟"
"ہاں"
"کب؟ میرا باپ کب مرا؟"
وہ رونے لگی،
نرس نے کہا،
"آج دوپہر بعد!"
رخسانہ کو چکر آرہے تھے، سارے بدن میں سنسنی چھا رہی تھی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں نرس سے پوچھا،
"اور لاش؟"
وہ دوسری طرف جاتی ہوئی، سادگی سے بولی،
"لاش خانہ میں!"
رخسانہ نے ایک چیخ ماری، اور پختہ فرش پر، دھڑام سے گر پڑی، سر کھل گیا، خون بہنے لگا، وہ بیہوش ہوگئی،

چاہیئے، دو تین نرسوں کی اور ڈیوٹی مقرر کر دو، میں بھی، دو تین مرتبہ آؤں گا!"

نرس نے کہا،

"خدا کرے اچھی ہو جائے، ایک رات کیا، لگاتار میں دس راتیں اس کے لیے جاگنے کو تیار ہوں، بڑی نیک اور شریف، اور مصیبت زدہ لڑکی ہے!"

دوسری نرس بولی،

"اب بچاری کا اس دنیا میں کوئی نہیں رہ گیا!"

ڈاکٹر سکندر نے پوچھا،

"باپ کے سوا، اس کا کوئی بھی نہیں تھا؟"

پہلی نرس بولی،

"نہیں ——— اسی کا تو افسوس ہے، یہ اچھی بھی ہو گئی، تو رہے گی کہاں؟ کرے گی کیا؟ کھائے گی کہاں سے؟"

دوسری نرس نے کہا،

"پچھلے سال میری چھوٹی بہن کا انتقال ہوا ہے، میں اسے بہن بنا کر اپنے پاس رکھوں گی!"

ڈاکٹر صاحب بولے،

"یہ باتیں تو بعد میں طے ہوتی رہیں گی، پہلے دعا کرو، خدا اسے اچھا کردے!"

باب ۱۹

کیا سے کیا؟

رخسانہ، تین دن تک بیہوش رہی، کبھی کبھی وہ چند منٹ کے لیے
ہوش میں آجاتی تھی، اور پھر بیہوش ہو جاتی تھی، ڈاکٹر سکندر کو اب
اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی، وہ بڑی تندہی سے اس کا علاج کر رہے
تھے، لیکن، اس کی حالت بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، صبح کو امید ہوتی تھی
اب بچ جائے گی، اور شام کو پھر یاس کی تاریکی امید کی مدھم روشنی پر
غالب آجاتی تھی،

تین دن تک یہی کیفیت رہی!

چوتھے روز ڈاکٹر سکندر نے ایک انجکشن دیا، اور نرس سے کہا،
"اگر مریضہ آج کی رات زندہ رہ گئی، تو پھر بچ جائے گی، لیکن
آج کی رات بہت احتیاط کی ضرورت ہے، تم کو رات بھر جاگنا

"نہیں آئے؟"

نیس نرس بولی،

"آے کے گئے!"

دوسری نے کہا،

"کہہ گئے ہیں، اب نہیں آؤں گا، کہہ دینا میرا انتظار نہ کریں؟"

رخسانہ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے مدہوش ہے، اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں، اور کہا،

"میں جانتی تھی ایسا ہی ہوگا، اب میں کس قابل رہ گئی ہوں کہ کوئی مجھے پوچھے، باپ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا!"

وہ پھر رونے لگی!

بڑی دیر تک روتی رہی!

پھر اس نے گردن ڈال دی، اور بیہوش سی ہوگئی،

ڈاکٹر مسکرایا،

"موت پر یہ غالب آگئی —— تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آجائے گی، لیکن ابھی احتیاط کی ضرورت ہے، ایک گھنٹہ کے بعد، میں پھر انجکشن دینے آؤں گا —— صبح تک اسے چار انجکشن مل جانے چاہئیں، اچھا میں جاتا ہوں!"

وہ چلا گیا، نرسیں، رخسانہ کو گھیر کر، اس کے آس پاس بیٹھ گئیں، صبح ہوتے ہوتے رخسانہ کی آنکھ کھولی، اب وہ رات والی کیفیت

اتنے میں رخسانہ نے کروٹ بدلی، اور ایک آہ کر کے آنکھ کھول دی اور ادھر ادھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی، جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو، پھر اس نے دروازے پر ٹکٹکی لگا دی؛ اور اس نے نرس سے پوچھا،

"نہیں آئے؟"

بڑی شفقت سے نرس نے کہا،

"کون ——— میری بہن، کسے پوچھتی ہو؟"

دروازے پر نظر ڈالے ڈالے وہ ذرا جھجکتی ہوئی بولی،

"ابا!"

نرس نے یہ نام سن کر سر جھکا لیا، کچھ نہ بول سکی، رخسانہ نے کہا،

"ابھی آئے تھے ——— اتنے دنوں بعد، اور پھر چلے گئے؟

رخسانہ رونے لگی!

نرس نے اسے تسلی دی،

"نہ رو، آجائیں گے، آتے ہوں گے!"

ڈاکٹر نے نرس سے کہا،

"یہی موقع ہے، اسے رونے دو، خوب رو لینے دو، بلکہ میں تو کہتا ہوں، اسے کسی طرح خوب رلاؤ، اگر یہ کھل کر رو لے گی، تو اس کا اچھا ہونا آسان ہو جائے گا!"

رخسانہ نے پھر پوچھا،

ہوئے کہا،
"سچ کہتی ہو بہن ــــــــ تم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے
ــــــ لیکن صرف تم پر نہیں، تم جیسی ہزار ہا ہزار مسلمان لڑکیاں
اور عورتیں ہیں، جو اپنا سب کچھ لٹا چکی ہیں، تم پھر خوش قسمت ہو،
ــــــــ"

رخسانہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا،
"خوش قسمت؟"

نرس بولی،
"ہاں! خوش قسمت، ــــــــ ذرا ان مسلمان لڑکیوں، اور عورتوں کا تصوّر کرو، جنھوں نے اپنا سب کچھ کھویا بھی، اور ہندؤں یا سکھوں کے قبضہ میں بھی چلی گئیں ــــــ تم تو پھر پاکستان میں ہو، مسلمانوں میں ہو، تمھارا ایمان سلامت ہے، تمھاری زندگی سلامت ہے!"

رخسانہ چپ ہو گئی، یہ باتیں کر کے وہ تھک بھی گئی تھی، اس نے آنکھیں بند کر لیں، اور تصور کی دنیا میں پہنچکر نہ جانے کیا سوچنے لگی، نرسیں یہ سوچ کر کہ مریضہ کو آرام کی ضرورت ہے اس کے پاس سے ہٹ گئیں، کوئی ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر سکندر آئے، ان کے آنے سے کچھ دیر پہلے، ایک نرس بھی آگئی تھی، ڈاکٹر صاحب نے نبض دیکھی تھرمامیٹر لگا کر بخار کا جائزہ لیا، پھر رخسانہ سے گویا ہوئے

نہیں تھی، اگرچہ بے حد کمزور تھی، لیکن چہرے پر بحالی تھی،

ایک نرس نے پوچھا،

"کیسی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، بڑے حسرت انگیز لہجہ میں بولی،

"اچھی ہوں —— لیکن کاش مر جاتی، اب بھی اگر زہر دے دو تو عمر بھر احسان مانوں گی!"

دوسری نرس نے کہا،

"توبہ توبہ —— اتنی ہراساں کیوں ہوتی ہو؟ دنیا میں کس کے ماں باپ ہمیشہ بیٹھے رہتے ہیں؟ تم تو ابھی جوان ہو، پہاڑ سی زندگی کاٹنی ہے تمہیں، اس طرح کی باتیں کرو گی، تو کیسے کام چلے گا؟ کیسے زندہ رہو گی؟"

رخسانہ نے کہا،

"زندہ رہنے کی ہوس کسے ہے؟ زندگی کی تمنا اس دل میں ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی مستقبل ہو، اور میرا مستقبل ماضی کے پردے میں گم ہو چکا ہے!"

ذرا سستا کر، رخسانہ نے پھر گفتگو کا سلسلہ جاری کیا،

"میری آخری پونجی میرا باپ تھا، اللہ نے اسے بھی چھین لیا —— تمہی بتاؤ، اب یہ پہاڑ سی زندگی کس کے سہارے کاٹوں گی؟ —— نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن —— نہ کوئی اور!"

رخسانہ کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے، نرس نے اس کی دل داری کرتے

"رخسانہ بانو!"
ڈاکٹر سکندر اُچھل پڑے، فوراً سوال کیا،
"کیا کہا؟ کیا نام بتایا؟"
رخسانہ بولی،
"میرا نام رخسانہ ہے!"
اب نرس خاموش تھی، ڈاکٹر سکندر سوال کر رہے تھے،
"آپ کا وطن؟"
"دہلی!"
"دہلی میں آپ کہاں رہتی تھیں؟ میرا مطلب ہے کس محلہ میں؟"
رخسانہ نے جواب دیا،
"سبزی منڈی میں!"
ڈاکٹر سکندر پر پھر حیرت اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت طاری ہوئی،
انھوں نے پوچھا،
"آپ سبزی منڈی میں رہتی تھیں؟"
رخسانہ نے کہا،
"جی ہاں! وہیں!"
ڈاکٹر نے پوچھا،
"جن صاحب کا انتقال ہوا ہے، یہ آپ کے والد ہی تھے نا!"
"جی! والد!"

"اب آپ کی طبیعت کا کیا رنگ ہے؟"

نرس بول پڑی،

"پہلے سے اچھی ہیں!"

ڈاکٹر نے کہا،

"تم سے نہیں، مریضہ سے سوال کر رہا ہوں!"

نرس خاموش ہو گئی، رخسانہ سے اس نے کہا،

"بولو ـــــ بتاؤ!"

ڈاکٹر صاحب سے رخسانہ نے کہا،

"اچھی ہوں، کمزوری بہت ہے!"

ڈاکٹر سکندر نے کہا،

"کمزوری تو جاتے جاتے جائے گی، ویسے اب آپ خطرے سے باہر ہیں!"

رخسانہ نے شکریہ ادا کیا، نہ جواب دیا، ڈاکٹر صاحب نے نرس سے کہا،

"یہ اس طرح دفعتہً بیمار پڑیں کہ رجسٹر کی خانہ پُری بھی نہ ہو سکی ـــــ تم اندراجات مکمل کرو!"

نرس نے رخسانہ سے پوچھا،

"تمھارا نام کیا ہے بہن؟"

رخسانہ بولی،

رخسانہ پھر وہی رخسانہ بن گئی جو پہلے کبھی تھی، اس نے

"میں کب کہتی ہوں، آپ یقین کریں، نہ کیجیے یقین!"

سکندر نے رخسانہ کی کیفیت کا ذرا بھی خیال نہ کیا، کہا،

"لیکن یقین کرنا ہی پڑے گا!"

رخسانہ کو سخت حیرت تھی، ڈاکٹر اس قسم کے سوالات کیوں کر رہا ہے؟

ان باتوں سے چڑ چلی تھی، اس نے ڈاکٹر سے پوچھا،

"ان سوالات سے آپ کا مطلب کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا،

"معلوم ہو جائے گا!"

عجیب مہمل جواب تھا، رخسانہ نے پھر پوچھا،

"کیا آپ حاجی صاحب کو جانتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے کہا،

"انھیں تو نہیں جانتا! ـــــــ لیکن آپ کو ضرور جانتا ہوں!"

یہ کہہ کر وہ مسکرایا، یہ مسکراہٹ رخسانہ کو زہر لگی، وہ جل ہی تو گئی،

اس نے بپھر کر پوچھا،

"کیا مطلب ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا،

"مطلب یہ کہ میں آپ کو جانتا ہوں، بس اس کے سوا، کوئی اور مطلب نہیں!"

"میں ان کا نام پوچھ سکتا ہوں ؟"
رخسانہ نے سادگی کے ساتھ کہا،
"حاجی عبدالستار !"
ڈاکٹر سکندر کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے، بیقراری کے عالم میں ٹہلنے لگے، ٹہلتے ٹہلتے، وہ رخسانہ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے،
"تم رخسانہ ہو ؟"
رخسانہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، اور کہا،
"جی !"
انھوں نے پھر پوچھا،
"حاجی عبدالستار سبزی منڈی والے کی لڑکی ؟"
رخسانہ کا پھر وہی جواب تھا،
"جی !"
ڈاکٹر سکندر پھر ٹہلنے لگے، ان کے چہرے کی اس وقت عجیب کیفیت تھی، ٹہلتے ٹہلتے، وہ پھر رخسانہ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے، انھوں نے پوچھا،
"واقعی ؟"
رخسانہ نے انھیں دیکھا، اور نظر نیچی کر لی، کوئی جواب نہ دیا، ڈاکٹر کا اضطراب اور بڑھ گیا، وہ پھر ٹہلنے لگا، اور ٹہلتے ٹہلتے اس نے کہا،
"یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا"

رخسانہ بولی،
"نہیں میں ضرور جاؤں گی، ہرگز یہاں نہیں رہوں گی!"
نرس پھر بولی،
"ضد نہ کرو بہن!"
رخسانہ نے کہا،
"تم مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں، یہ ہسپتال نہیں، بدمعاشوں کا اڈہ ہے ——— وہ لوگ کتنے سنگدل ہیں، جو مظلوم، اور تباہ حال عورتوں کا مذاق اڑاتے ہیں، انھیں چھیڑتے ہیں!"
نرس نے زبردستی رخسانہ کو پھر بستر پر بٹھا دیا، ڈاکٹر قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا، رخسانہ رونے لگی، ڈاکٹر نے کہا،
"مجھے بہت افسوس ہے کہ میرے الفاظ سے آپ کو تکلیف پہنچی، خدا کی قسم، میرا مقصد، آپ کو چھیڑنا یا آپ کا مذاق اڑانا نہیں تھا!"
رخسانہ نے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ پوچھا،
"پھر کیا مقصد تھا آپ کا؟"
ڈاکٹر نے بڑی سادگی سے کہا،
"صرف اظہار مسرت؟"
"آپ میرے کون ہوتے ہیں؟ آپ کیوں مسرور ہیں؟"
ڈاکٹر نے بڑی سنجیدگی، اور ملائمت کے ساتھ کہا،
"میں آپ کا بھائی ہوں؟ مجھے مسرور ہونے کا حق ہے، میرا یہ حق

پھر وہی مہمل باتیں! رخسانہ کو غصہ آگیا۔

"کیا آپ کی خوش طبعی مجھ جیسی مظلوم، اور بے بس عورتوں ہی کو اپنا شکار بناتی ہے؟"

ڈاکٹر سکندر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، اور کہا،

"آپ بالکل غلط سمجھیں ———— میرا مطلب یہ نہیں تھا، کہ آپ کو چھیڑوں، اگر مجھ سے کوئی بے ادبی ہوئی ہے تو معافی چاہتا ہوں لیکن، میں پھر کہوں گا، اور اصرار کے ساتھ کہوں گا، کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور شاید عنقریب آپ بھی مجھے جان لیں گی!"

رخسانہ کبھی اتنی حیران نہیں ہوئی تھی، جتنی آج!

وہ حیرت سے ڈاکٹر سکندر کا چہرہ دیکھنے لگی، اس نظر میں حیرت بھی تھی، غصہ بھی، اور شرم بھی،

ڈاکٹر نے کہا،

"مجھے آپ کو پاکر بہت مسرت ہوئی!"

رخسانہ کا چہرہ تمتما اٹھا، اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا،

"شیطان، بدمعاش!"

پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اٹھی،

"میں جاتی ہوں!"

نرس نے کہا،

"تم بہت کمزور ہو، نہ اٹھو، اپنی جگہ بیٹھی رہو!"

سکندر نے کہا،

"معلوم ہو گا، ضرور معلوم ہو گا!"

"لیکن کب؟"

"بہت جلد!"

رخسانہ نے پوچھا،

"ابھی کیوں نہیں؟"

سکندر نے کہا،

"ابھی صرف اتنا کافی ہے کہ تم میری عزیز ترین بہن ہو اور میں تمھارا
ترین بھائی ہوں، ——— فی الحال اسی پر اکتفا کرو، بہت جلد
اس رشتہ کی تفصیل بھی تمھیں بتا دوں گا!"

رخسانہ خاموش ہو گئی، اس نے سوچا، ایک آدمی جب بھائی بننے
کو تیار ہوا ہے، تو مجھے بحث کرنے کی ضرورت نہیں، بھائی، ہر مسلمان ہے، ہر
مسلمان ہے، اس رشتہ پر میں کیوں بگڑوں؟ یہ سوچ کر وہ خاموش
ہو گئی، سکندر نے کہا،

"بہن میں جانتا ہوں، تمھارے دل میں اس وقت ایک ہلچل مچی
ہوئی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ مجھے اس کا احساس ہے، لیکن میں مجبور
ہوں، جو کچھ کہہ چکا، اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا!"

رخسانہ نے یہ باتیں خاموشی کے ساتھ سنیں، سکندر نے کچھ دیر خاموش رہ
کر پھر کہا،

دُنیا میں کوئی نہیں چھین سکتا، حتیٰ کہ آپ بھی نہیں ——

رُخسانہ پھر حیران حیران اسے دیکھنے لگی، سکندر نے کہا،

"آپ کو حیرت ہو رہی ہے، اور ہونی بھی چاہیئے، لیکن بہت جلد آپ کی حیرت دور ہو جائے گی، اور آپ میرے ایک ایک حرف کی تصدیق کرنے پر مجبور ہوں گی!"

رُخسانہ دل ہی دل میں حیران تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا سمجھے، اور کیا کہے؟ وہ اسی خیال میں جز بز رہی تھی، کہ ڈاکٹر سکندر کی آواز اس کے کان میں پہنچی،

"آج نہیں، کافی عرصہ ہُوا، میں تمھیں اپنی بہن بنا چکا ہوں —— قول مرداں جان دارد، میں نے تمھیں بہن کہہ دیا ہے، تو زندگی کی آخری سانس تک تم میری بہن رہو گی —— دنیا میں میری کوئی بہن نہیں تھی، اور اس کا مجھے بڑا غم تھا، لیکن تمھیں پا کر میں اپنا غم بھول گیا اب میں خوش ہوں، بہت خوش، میری اس خوشی پر کوئی ڈاکہ نہیں ڈال سکتا!"

بہن بھائی کا رشتہ سُن کر رخسانہ کا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا، اب وہ اطمینان اور خاموشی سے ڈاکٹر سکندر کی باتیں سُن رہی تھی، سنتے سنتے اُس نے کہا،

"لیکن آپ نے کس طرح مجھے اپنی بہن بنا لیا؟ آپ مجھے کیونکر جانتے ہیں؟ یہ تو معلوم ہو؟"

دِل نے کہا،
ہرگز نہیں!'
اور، رخسانہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سکندر کے ہاں ہرگز نہیں جائے

سہ پہر کو، کوئی پانچ کے قریب ڈاکٹر سکندر، تشریف لائے، ان کے ساتھ، ان کی بے حد حسین و جمیل بیوی طلعت بھی تھی، سکندر نے رخسانہ سے کہا،
"یہ ہیں، میری بیوی اور تمھاری بھابی طلعت!"
پھر طلعت سے کہا،
"یہ ہے میری چھوٹی، اور بہت عزیز بہن، رخسانہ! ——————
رخسانہ، جس کا ہم آپس میں اکثر ذکر کیا کرتے تھے!"
طلعت نے رخسانہ کو گلے سے لگا لیا، اور، رونے لگی، اس نے کہا،
"میری اچھی بہن، میں جانتی ہوں، تم نے کتنے دُکھ سہے ہیں، وہ دُکھ پہاڑ کو سہنے پڑتے، تو وہ سرمہ ہو جاتا، لیکن خدا کا شکر ہے، مصیبت کا بھیانک دور ختم ہو گیا، اب تم اپنے آزاد ملک پاکستان میں ہو، اور تمھیں اپنے بھائی کے گھر چلنا ہے، ابھی، اسی وقت!"
رخسانہ، سکندر سے تو انکار کر سکتی تھی، لیکن طلعت سے کس طرح انکار کرتی؟

طلعت نے چند منٹ کے اندر، اپنے سبھاؤ، اور پیار سے اس کا دِل موہ لیا تھا، رخسانہ کا دِل خود بخود اس کی طرف کھنچ رہا تھا، نہ ہاں کرتے

بہن کی جگہ بھائی کے گھر میں ہوتی ہے، تمھیں ہسپتال کے وارڈ کے بجائے، میرے گھر میں رہنا چاہیے۔ وہاں تمھارا پرہیز بھی اچھی طرح ہو گا علاج بھی، اور تفریح بھی، میں چاہوں، تو تمھیں ابھی لے جا سکتا ہوں، چلوگی؟"

رخسانہ سخت حیران اور ششدر تھی، کہ ان باتوں کا جواب کیا دے اس نے ڈاکٹر کو بھائی مان لیا، خیر یہاں تک کوئی مضائقہ نہیں لیکن نام کے بھائی، اور حقیقتاً غیر آدمی کے گھر وہ کس طرح اٹھ جائے، ——— ناممکن، قطعاً ناممکن!

ابھی وہ انکار کرنے نہ پائی تھی کہ خود ڈاکٹر نے کہا،

"اس وقت نہیں، یوں نہیں، میری بیوی تم سے ملنے کی، بہت زیادہ مشتاق ہیں، میں جاتا ہوں، انھیں خبر دوں گا کہ میری گم شدہ بہن مل گئی، وہ آئیں، اور تمھیں، تمھارے گھر میں لے جائیں گی ——— تم مجھ سے انکار کر سکتی ہو، لیکن طلعت سے نہیں!"

اور بغیر، رخسانہ کا جواب سنے، بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کرتا ہوا ڈاکٹر چلا گیا!

ڈاکٹر چلا گیا! اور رخسانہ سوچ میں پڑ گئی، یہ کیسا طلسم ہے؟ کیا راز ہے یہ اجنبی ڈاکٹر میرا بھائی کیونکر بن گیا؟ یہ مجھے اپنے گھر کیوں لیے جا رہا ہے اس کی بیوی مجھے لینے کیوں آئے گی؟

کیا میں چلی جاؤں؟

"رخسانہ تمھیں میرے ساتھ بہرحال چلنا پڑے گا ——— تم تو بڑی اچھی بہن ہو، آؤ، شاباش، ضد نہیں کرتے!"

اس مرتبہ، رخسانہ طلعت سے اپنا ہاتھ نہ چھڑا سکی، آگے آگے اسکندر اس کے پیچھے طلعت اور اس کے پیچھے رخسانہ!

نرسوں کو بھی حیرت تھی کہ یہ نیا رشتہ زمین سے اُبل پڑا، وہ بھی اس اصرار، اور اس کشمکش پر حیران تھیں، لیکن ہسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر کا معاملہ تھا، کچھ بول نہ سکیں، خاموشی کے ساتھ یہ تماشہ دیکھتی رہیں!

ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا، ڈاکٹر سکندر اپنی فیملی کے ساتھ اسی میں رہتے تھے، طلعت نے اس بنگلہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سجایا تھا، بالکل آئینہ خانہ معلوم ہوتا تھا، ایک ایک چیز سے طلعت کی سلیقہ مندی اور آرائش پسندی آشکارا تھی۔

تینوں آکر ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ گئے، طلعت نے گھنٹی بجائی ایک خادمہ سامنے آکر کھڑی ہوگئی، طلعت نے اس سے کہا،

"چائے لاؤ!"

فوراً ہی چائے آگئی، طلعت نے بنائی، پہلے رخسانہ کی طرف پیالی بڑھائی، پھر اسکندر کی طرف، پھر اپنی طرف،

چائے کا شغل جاری تھا کہ سکندر نے کہا،

"یہ رخسانہ بہن خفا ہو گئی تھیں مجھ سے؟"

طلعت نے پوچھا،

بنتی تھی، نہ نہیں!

رخسانہ نے کوئی جواب نہیں دیا، طلعت نے کہا،

"میں تمہیں لینے آئی ہوں رخسانہ! ——— چلو، میرے ساتھ!"

رخسانہ چہ کنم کے پھیر میں پڑی تھی، اس سے کچھ کہتے بنتے نہیں بن پڑ رہا تھا ابھی بھی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا،

طلعت اُٹھ کھڑی ہوئی، اس نے رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، اور کہا،

"چلو، ——— میں کوئی عذر سننے کے لیے تیار نہیں ہوں!"

رخسانہ نے کسمسا کر ہاتھ چھڑا لیا، اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی، وہ سوچ رہی تھی، جائے، یا نہ جائے؟ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی، کہ نہ جائے تو جائے کہاں؟ اور اگر جائے، تو نہ جانے کیا پیش آئے؟ اور وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ، نہ جانے اس کے ٹاٹ کے گھر کا کیا حال ہوا ہوگا! وہ خالی تو نہیں ہوگا، کسی نہ کسی نے ضرور اس پر قبضہ کر لیا ہوگا، اور نہ بھی کیا ہو، تو بھی ایک جوان عورت، کھلے میدان میں، ٹاٹ کے پردوں کی آڑ ے کر کس طرح رہ سکتی ہے؟ دل ہی دل میں اس نے سوال کیا،

"کیا چلی جاؤں، طلعت کے ساتھ؟"

اور دل نے جواب دیا،

"جانا ہی پڑے گا، اس کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی تو نہیں ہے!"

ایک لمحہ کے اندر یہ ساری باتیں رخسانہ کے ذہن میں آئیں، طلعت نے اسے پھر جھنجوڑا،

چائے کے بعد، سکندر نے کہا،

"اب سیر ہوگی، رخسانہ بہن کو، کراچی کی سیر کرائیں گے، تیار ہو جاؤ، طلعت دیکھو دیر نہ کرنا!"

طلعت جلدی جلدی تیار ہوئی، اس نے، رخسانہ کو بھی نہلا دھلا کر اور اچھے سے کپڑے پہنا کر دلہن بنا دیا، آج رخسانہ پھر وہی رخسانہ نظر آ رہی تھی، جو دلّی میں، فساد سے پہلے نظر آتی تھی، وہی نظر فروز حسن، وہی دل کو موہ لینے والی معصومیت، وہی سادگی، وہی چھب، طلعت نے کہا،

"رخسانہ —— آئینہ نہ دیکھنا، نظر لگ جائے گی!"

رخسانہ شرما گئی، طلعت مسکرا دی، سکندر کی آواز آئی،

"چلو بھئی!"

رخسانہ کا دل سیر و تفریح پر بالکل آمادہ نہیں تھا، لیکن اس کا نیا بھائی کس محبت سے اسے لیجا رہا تھا، وہ انکار بھی نہ کر سکی، طلعت اور رخسانہ پھر ڈرائنگ روم میں آئیں، سکندر نے کہا،

"بڑی دیر کر دی!"

طلعت بولی،

"بالکل دیر نہیں ہوئی، بہت وقت ہے!"

تینوں باہر آئے، کار تیار کھڑی تھی، سکندر خود ڈرائیو کر رہا تھا، طلعت اور رخسانہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں، کیماڑی، کلفٹن، گورنر جنرل ہاؤس،

"کیوں ؟"

سکندر نے جواب دیا،

"یہ ان سے پوچھو ———— مجھے شیطان، اور بدمعاش تک کہہ دیا
اس کے بعد، بس جوتہ پڑنے کی کسر رہ گئی تھی، بڑے تیکھے مزاج کی ہیں،
ذرا سنبھل کر رہنا!"

رخسانہ بہت شرمندہ ہوئی، اس کا ایک رنگ آرہا تھا، ایک جا رہا تھا
اس نے کہا،

یہ باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے، میں آپ کو سمجھی نہ تھی معاف کر دیجیے!
سکندر نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا،

"معاف تو اسی وقت کر دیا تھا۔ میں تو طلعت کو خبردار کر رہا ہوں،
ذرا سنبھل کر رہیں!

رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اس نے کہا،

"آپ مجھے ایسا لڑاکا سمجھتے ہیں، تو لائے کیوں ؟"

سکندر نے کہا،

"ارے تم پھر خفا ہو گئیں ؟ بخدا میں تو مذاق کر رہا تھا!"

طلعت نے رخسانہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہا،

"للہ ان کی باتوں کا اثر نہ لو۔ یہ اسی طرح سارے گھر کو پریشان
کیا کرتے ہیں، خود میرا ناطقہ انھوں نے تنگ کر رکھا ہے، دن میں ایک آدھ
بات ضرور ایسی کہہ گزریں گے کہ تن بدن میں آگ لگ جائے!"

"تشریف لیجائیے، مجھے آپ سے زیادہ رُخسانہ کا خیال ہے!"
سکندر چلا گیا، طلعت رُخسانہ کو لے کر، ایک کمرہ میں آئی، یہاں چارپائی پہلے سے بچھی تھی، بستر لگا تھا، طلعت بولی،

"شب بخیر"——— اب انشاءاللہ صبح ملیں گے!"

طلعت چلی گئی، اور رُخسانہ خاموشی سے آکر بستر پر لیٹ گئی، دلّی چھٹنے کے بعد سے آج پہلی مرتبہ اسے ایک سجا ہوا کمرہ ملا تھا، ایک آرام دہ بستر میسر آیا تھا، وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی، آج کے انقلاب پر غور کر رہی تھی اس نے لوگوں کی قسمت بدلنے کے واقعات سنے بھی تھے، اور کتابوں میں پڑھے بھی تھے، لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ خود اس کی قسمت اتنے بڑے انقلاب سے آشنا ہو جائے گی، دلّی چھوڑنے کے بعد سے اب تک اس نے کیا کیا مصائب نہیں سہے تھے، کیسی کیسی تکلیفیں نہیں برداشت کی تھیں، لیکن عین اس وقت جب دُنیا میں اس کا کوئی نہیں رہ گیا تھا، کوئی ایسا ٹھکانا نہیں تھا، جہاں وہ رہ سکے، اور عزت آبرو کی زندگی بسر کرسکے، دفعتاً اسے ایک بھائی مل گیا، ایک بہن مل گئی، ایک شاندار گھر مل گیا، ایک اچھا سا کمرہ مل گیا، ایک آرام دہ بستر مل گیا، وہ بار بار سوچتی تھی، یہ خواب ہے یا حقیقت؟

وہ الف لیلہ کے ابوالحسن کی طرح بار بار آنکھیں ملتی تھی، اپنے چٹکی لیتی تھی، تاکہ باور کرسکے کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی ہے، بیدار ہے، اور بار بار تصدیق ہوتی تھی کہ واقعی وہ جاگ رہی ہے، سو نہیں رہی ہے

فریرہال، ہنس گارڈن، گاندھی گارڈن، پیلس ہوٹل، یہ تمام مقامات سکندر نے دکھائے، طلعت رخسانہ کو بتاتی جاتی تھی، یہ وہ جگہ ہے، یہ فلاں مقام ہے!

رخسانہ حقیقتاً بے دلی سے، لیکن بظاہر توجہ سے طلعت کی باتیں سن رہی تھی، پھر کار ایک شاندار سنیما کے سامنے رکی، سکندر نے کہا،

"سنیما دیکھیں گے!"

طلعت بولی،

"ضرور دیکھیں گے!"

رخسانہ سے نہ کسی نے کچھ پوچھا، نہ اس نے کچھ کہا، نیو تھیٹرز کی کوئی فلم تھی اور اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں، جنھوں نے نیو تھیٹرز کو نیو تھیٹرز بنا دیا ہے، کافی رات گئے، یہ لوگ واپس آئے، سکندر نے طلعت سے کہا،

"بہت بھوک لگی ہے، جلدی کھانا منگواؤ، ورنہ میں تمھیں کھا جاؤں گا!"

ایک عرصۂ دراز کے بعد، رخسانہ کے لب ایک سکنڈ کے لیے تبسم سے آشنا ہوئے، اتنے میں کھانا آگیا، سکندر نے جلدی جلدی کھانا کھایا، اور طلعت سے کہا،

"میں تو اب ہسپتال ڈیوٹی پر جاتا ہوں، تم لوگ آرام کرو —— دیکھو رخسانہ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے!"

طلعت نے مسکراتے ہوئے کہا،

دِل کی باتیں

ایک شاندار کوٹھی ہے، نہایت وسیع، اور کشادہ!

سامنے صحن ہے، صحن کیا ہے تختۂ گلزار ہے، خوبصورت پھولوں کی بیلیں، اور درخت لگے ہوئے ہیں، نہایت سلیقہ سے چمن بندی کی گئی ہے، کوٹھی میں کئی کمرے ہیں، ہر کمرہ، بڑے سلیقہ سے سجا ہوا ہے، ڈرائنگ روم کی زینت، اور بیڈ روم کی آرائش خاص طور پر قابل دید ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ اس مکان کا مکین، بڑی ستھری طبیعت اور اچھے ذوق کا مالک ہے، لیکن اس سجاوٹ، اور آرائش کے باوجود، گھر پر ایک سناٹا سا چھایا ہوا ہے،

سکوت!

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یوں دفعتہً انقلاب آجائے؟ اور قسمت بدل جائے؟

رخسانہ کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی، لیکن نیند کا کہیں کوسوں پتہ نہیں تھا، اسے کوئی تکلیف نہیں تھی، وہ سونا چاہتی تھی، لیکن سو نہیں سکتی تھی، نیند کا اس کے آس پاس کہیں گزر نہیں تھا، آج جو واقعہ اس پر گزرا تھا، نہ اس پر یقین کرتے بنتا تھا، نہ انکار کرتے!

یقین اس لیے، نہیں کہ، ایسی بات آج تک نہ دیکھی نہ سُنی، اور انکار کی جرأت، اس لیے ناپید تھی، کہ آنکھوں دیکھی چیز کا انکار، اگر کوئی کرے بھی تو سب اسے احمق کہیں گے!

پھر؟

پھر یہ کیا ماجرا تھا ——— یہ سکندر کون ہے؟ یہ طلعت کون ہے؟ سکندر ابّا کو کس طرح جانتا ہے؟ میرا نام اسے کیسے معلوم ہُوا؟ یہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں اس کے کیا کام آسکتی ہوں؟

صبح کے چار بج گئے، اور رخسانہ یہی سوچتی رہی، نسیم سحر نے چپکے سے، رخسانہ کو لوری دے کر، عالم بیداری سے عالم خواب میں پہنچا دیا!

بہت دنوں کے بعد، وہ آرام اور سکون سے سوئی!

بے خبر نیند!

"مس کیتھرائن، اچھی تو ہو؟"

اس نے ایک قیامت خیز انداز کے ساتھ، نوجوان کو دیکھا، پھر آنکھیں نیچی کر لیں، اور نظریں جھکائے جھکائے کہا،

"آپ کو کہا؟"

نوجوان نے کہا،

جب سے تم نے آنا چھوڑا ہے، ہمارا ٹینس کورٹ ویران پڑا ہے ——— "کیپٹن آغا کہہ رہے تھے، اگر مس کیتھرائن دو چار دن اور نہ آئیں تو وہ خودکشی کر لیں گے!"

وہ ذرا، اور قریب ہو کر بولی،

"کر لیں!"

نوجوان نے کہا،

"بڑی ظالم ہو تم ——— اپنے جاں نثاروں کے ساتھ یہ برتاؤ!"

وہ ذرا مسکرائی، پھر سنجیدہ ہو کر بولی،

"اور آپ؟"

نوجوان جھینپ سا گیا، اس نے کہا،

"میرا کیا ذکر!"

وہ بولی،

"زیادہ بنئے نہیں ——— آج میں صاف صاف گفتگو

سکون!

معلوم ہوتا ہے یہاں کا رہنے والا تامل کی زندگی سے ابھی آشنا نہیں ہُوا ہے، یا کوئی ایسا مردم بیزار ہے، جو خلوت کی زندگی کو، جلوت کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے،

لان کے ایک طرف ٹینس کورٹ ہے، شام کو چند خاص دوستوں کا اجتماع ہوتا ہے، اور مغرب تک ٹینس کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس گھر کا مالک ایک خوش پوشاک، خوش رو، اور خوش اندام نوجوان ہے ابھی ابھی وہ باہر سے آیا ہے، اور کوٹھی کے برآمدہ میں ایک آرام کرسی پر دراز سگریٹ کا دھواں اڑا رہا ہے، معلوم ہوتا ہے کسی گہری سوچ میں ہے، اتنے میں ایک موٹر سائیکل پورٹیکو میں آکر ٹھہری، ٹینس کا بلا ہاتھ میں لیے، ایک نہایت دیدہ زیب اور طرحدار اینگلو انڈین لڑکی مسکراتی ہوئی اتری، بلا کا حسن، اور قیامت کی ادائیں، اینگلو انڈین ویسے بھی، یورپینوں کے مقابلہ میں خوبصورت ہوتے ہیں، لیکن اس لڑکی نے تو خوبصورتی کا ریکارڈ توڑ دیا تھا اگر مقابلۂ حسن میں شریک ہوتی یقیناً سب سے بازی لے جاتی،

نوجوان کی آرام کرسی کے قریب چند کرسیاں پڑی تھیں، ایک کرسی پر وہ بیٹھ گئیں، پھر اطمینان سے اس نے کھسکا کر، اسے آرام کرسی سے اور قریب کرلیا، نوجوان اسے دیکھ کر اُٹھ بیٹھا، بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا، دونوں میں انگریزی میں باتیں ہونے لگیں، نوجوان نے کہا،

کیتھرائن نے پھر کہا،

"میں خوبصورت ہوں، غریب بھی نہیں، میرا خاندان بہت اونچا ہے، تعلیم یافتہ بھی ہوں، لوگ میری آرزوئیں کرتے ہیں، میرے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے ہیں، مجھے رفیقۂ حیات بنانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں، مگر میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی، ڈیڈی نے کتنا کتنا زور دیا، ممی کتنی پیچھے پڑیں، لیکن مجھے کوئی رام نہ کر سکا ——— کیوں؟"

"بتاؤ؟"

"اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں، تمھاری خاطر سب کو چھوڑ سکتی ہوں، سب سے بغاوت کر سکتی ہوں، تم میرے لیے سب کچھ ہو، تمھارے مقابلہ میں ہر چیز ہیچ ہے، میرے دل پر تمھاری حکومت ہے، میری آنکھوں میں صرف تم بسے ہو ———"

اگر نوجوان نہ روکتا، تو شاید کیتھرائن کی تقریر کا سلسلہ جاری رہتا، نہ جانے کتنی دیر تک، لیکن اس نے ٹوکا،

"مس کیتھرائن!"

وہ خاموش ہو گئی، اور اس کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگی، نوجوان نے کہا،

"میں نے تمھاری باتیں سن لیں"

وہ بیتابی کے ساتھ بولی۔

کرنے آئی ہوں، آپ سے!"

نوجوان نے کہا،

"میں بالکل نہیں سمجھا، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ بولی،

"میں سمجھائے دیتی ہوں ——— سنیئے، اشارے کنارے میں بہت کچھ کہہ چکی، مگر یا تو آپ حد سے زیادہ بے وقوف ہیں، یا ضرورت سے زیادہ چالاک، ——— اب تک آپ نے یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ آپ کتنے پانی میں ہیں؟ آپ کے دل میں کیا ہے؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

نوجوان سنبھل کر بیٹھ گیا، اس نے کہا،

"تم اب بھی اشارے کنائے میں بات چیت کر رہی ہو، صاف صاف کہو، تو میں کچھ جواب بھی دوں!"

مس کیتھرائن نے کہا،

"صاف صاف سنیئے گا؟"

نوجوان نے کہا،

"ہاں!"

وہ بولی،

"میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

نوجوان کا چہرہ فق ہو گیا، وہ اتنی صاف گفتگو کے لیے تیار نہیں تھا،

نوجوان نے کہا،

"لیکن، ــــــــــ لیکن تم نے اس دروازے پر دستک دی ہے، جو بند ہو چکا ہے، اور کبھی نہیں کھل سکتا ــــــــــ کبھی نہیں، ہرگز نہیں!"

یہ الفاظ بجلی بنکر کیتھرائن پر گرے، اس کا چہرہ سفید پڑ گیا، جیسے رہائی پاتے پاتے کسی ملزم نے پھانسی کا حکم سن لیا ہو، کچھ دیر وہ خاموش رہی، پھر بولی،

"کیوں؟"

نوجوان نے ایک آہ سرد کھینچکر کہا،

"یہ پوچھ کر کیا کرو گی، مس کیتھرائن؟"

کیتھرائن نے پھر کچھ نہ پوچھا، البتہ اس کی آنکھیں موتی برسانے پر تلی ہوئی تھیں، نوجوان نے اس کا یہ رنگ دیکھ کر بڑی نرمی کے ساتھ کہا،

"میری زندگی ایک ٹریجڈی ہے، اور اب یہ کامیڈی نہیں بن سکتی، میرا دل ٹوٹ چکا اور اب یہ کبھی نہیں جڑ سکتا، میں موت کو بلاتا ہوں لیکن وہ مجھ سے دور بھاگتی ہے، ہر روز جب کسی کے مرنے کی خبر سنتا ہوں تو مرنے والے پر مجھے رشک آتا ہے، میری زندگی آگ نہیں، برف ہے، میں زندہ ہوں، لیکن زندگی کی حرارت سے محروم ہوں، اور وہ حرارت اب کبھی واپس نہیں آ سکتی!"

کچھ سوچتے سوچتے کیتھرائن نے کہا،

"پھر بولو، کیا کہتے ہو تم؟ کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

نوجوان نے کہا،

"بہت ممنون ہوں، مس کیتھرائن کہ تمھاری نگاہ انتخاب نے مجھے پرکھا

کیتھرائن بیچ میں بول پڑی،

"مجھے اپنے انتخاب پہ ناز ہے، تم جیسا کوئی ہو تو لے"

نوجوان نے کہا،

"شکریہ! لیکن ——"

وہ بولی،

"یہ رسمی باتیں ہیں، اور تم جیسے بااُصول نوجوان کی زبان سے اچھی نہیں لگتیں!"

نوجوان نے کہا،

"سنو تو، سن تو لو!"

وہ مسرت کے نشہ میں جھومتی ہوئی بولی،

"سن رہی ہوں، کہو ——"

نوجوان نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے کہا،

"شکریہ ادا کرنے کے باوجود، ایک بات میں صاف کر دینا چاہتا ہوں!"

وہ ایک زہد شکن انگڑائی لیتی ہوئی، بولی،

"اونہہ کہہ بھی چکو!"

نوجوان نے کہا،

"آج سے کچھ عرصہ پہلے اگر تم نے یہ باتیں کہی ہوتیں تو میں بڑے شوق سے تمھاری ہر بات کی تصدیق کرتا، کسی بات کے ماننے سے انکار نہ کرتا، لیکن اب؟ ——————— کیتھرائن مجھے نہ چھیڑو، یہ باتیں نہ کرو، مجھے وحشت ہوتی ہے!"

اور واقعی نوجوان کے چہرہ پر وحشت کے آثار طاری ہو گئے، اس کا یہ رنگ دیکھ کر کیتھرائن گھبرا گئی، اتنے میں ایک چھوٹی سی خوبصورت کار آ کر رُکی، اور اس میں سے ڈاکٹر سکندر، ہشاش بشاش، برآمد ہوئے، سکندر کو دیکھ کر کیتھرائن کھڑی ہو گئی، اور نوجوان اسی طرح ٹہلتا رہا، سکندر، سگار کے کش لگاتا ہُوا، آ کر کرسی پہ بیٹھ گیا، اس نے کہا:

"میں سمجھا!"

ڈورے ڈالے جا رہے ہیں!

اور!

"اور، رسیاں تڑائی جا رہی ہیں!"

کیتھرائن، اُردو سے نا واقف تھی، وہ ان الفاظ کا مطلب بالکل نہیں سمجھی حیرت سے سکندر کی طرف دیکھنے لگی، نوجوان نے سب کچھ سُنا لیکن، گویا، نہیں سنا، سکندر نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا،

"کیا ہو رہا ہے، مجذوب صاحب؟"

وہ سکندر کو دیکھ کر، کہنے لگا،

"تم کسی اور کو چاہتے ہو، اگر یہ بات ہے تو کہہ دو، میں پیچھے ہٹ جاؤں گی!"

نوجوان نے از خود رفتگی کے عالم میں کہا،

"کیسی باتیں کرتی ہو، کیتھرائن ——— تم یہ سمجھ لو، کہ میں مرگیا اور مُردوں پر آنسو بہائے جا سکتے ہیں، ان سے امیدیں نہیں قائم کی جا سکتیں، انھیں زندگی کا شریک نہیں بنایا جا سکتا،
کیا کہا تم نے، میں کسی اور کو چاہتا ہوں؟"

کیتھرائن بولی،

"ہاں!"

وہ بولا،

"غلط، بالکل غلط ——— چاہ، محبت، عشق، اُلفت
یہ سب زندگی کے کھیل ہیں، اور میں تم سے کہہ چکا ہوں، مجھے اگر زندہ سمجھتی ہو تو غلطی کرتی ہو!"

کیتھرائن جھنجلا کر بولی،

"اچھے بھلے آدمی کو، مُردہ کیسے سمجھ لوں؟ ——— کام کرتے ہو، کھاتے ہو، پیتے ہو، احباب سے لطف اندوز ہوتے ہو، پھر تم زندہ نہیں مُردہ ہو ——— مجھے بیوقوف نہ بناؤ
میں سمجھ گئی، تم مجھے نہیں چاہتے، مجھ سے نفرت کرتے ہو، تمھاری زندگی میں کوا اور عورت داخل ہو چکی ہے، تم اسی کے لیے وقف ہو چکے ہو!

سکندر نے کہا،

"کیوں نہیں؟ یہ رہیں مس کیتھرائن، پوچھ لو ان سے، کچھ جھوٹ کہتا ہوں؟"

کیتھرائن مسکرا کر بولی،

"بڑے بچے!"

آغا نے کہا،

"یار بڑے بے غیرت ہو، اتنی تو تمھاری ہوا اُکھڑی ہوئی ہے، پھر بھی بولو گے ضرور!"

سکندر نے جواب دیا،

"جی نہیں، ہوا حضور کی اکھڑی ہوئی ہے۔ مجھ سے تو مس کیتھرائن نے بات بھی کر لی، تمھاری طرف تو رُخ بھی نہیں کیا! ——— یقین نہ ہو تو ذرا بات کر کے دیکھو، پھر معلوم ہو گا ——— واعظ کے سر پہ ایک بدلی تڑاق سے ——— پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں ——— اس شعر کا مطلب کیا ہے؟"

آغا ہنسنے لگے، اس نے کہا:

"بڑے شیطان ہو!"

"اور حضور چھوٹے ہیں!"

آغا پھر ہنسنے لگا، کیتھرائن نے کہا،

"تم لوگ ایٹی کیٹ تک سے واقف نہیں ہو؛ مہذب سوسائٹی

"کچھ نہیں، آؤ بیٹھو!"

سکندر نے کہا،

"میں بیٹھوں، اور تم چہل قدمی کرتے رہوگے؟ کیوں جی؟"

نوجوان پھر آرام کرسی پہ آکر بیٹھ گیا، کیتھرائن بھی اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی

سکندر نے کہا،

"کیا رازو نیاز ہو رہے تھے؟ ——————— ہمارا مژدہ دیکھو، ہم سے چھپاؤ!"

نوجوان کے لبوں پہ خفیف سے تبسم نمودار ہوا، اور وہ پھر سنجیدہ بن گیا، اس نے کہا،

"کچھ نہیں ——————— اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں. تم تو بال کی کھال نکالتے ہو!"

"بجا ارشاد ہوا!"

اتنے میں ہارن بجا، اور پھر ایک موٹر سائیکل آئی، اس پہ سے کیپٹن آغا، برآمد ہوئے، نہایت فیشن ایبل، خوبصورت، اور خوش وضع، آغا کو دیکھتے ہی، سکندر نے کہا،

"آیئے تشریف لایئے، آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا!"

وہ مسکراتا ہوا بولا،

"انتظار ہو رہا تھا؟ میرا؟ مجھے بھی کوئی یاد کرتا ہے؟ میرا بھی کوئی انتظار کرتا ہے؟"

"آپ تشریف لے جائیے، بندہ تو ابھی بیٹھا ہے (نوجوان کی طرف اشارہ کرکے) یہ ڈاکٹر قریشی کہیں تو بھی نہیں جاؤں گا، بیٹھے رہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟"

ڈاکٹر قریشی کو بھی ہنسی آگئی، اس نے کہا،

بہت خوب! ——— میری کوٹھی رہ گزر ہے! کیوں جناب؟

سکندر نے کہا،

"رہ گزر نہیں، دیر و حرم سہی بہرحال بیٹھوں گا یہیں!"

"آغا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد، سکندر نے قریشی سے کہا،

"یار تمھیں ایک تکلیف دینا تھی!"

قریشی نے کہا،

"سر آنکھوں پر ——— فرمایئے!"

"کل رات کو کھانا ہمارے ہاں کھاؤ!"

"کھالیں گے ——— لیکن یہ اہتمام کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ ——— بس ہمارا جی چاہ رہا ہے، اور کیا؟ ——— بڑے لاجواب کھانے پکوائے ہیں، انگلیاں چاٹو گے بخدا!"

قریشی نے کہا،

"میں آپ کی طرح چٹورا تو ہوں نہیں، جو انگلیاں چاٹنے لگوں۔

کے لیے باعث ننگ ہو!"

آغا تو چپ رہا۔ سکندر نے پوچھا،

"یہ کیوں سرکار؟"

کیتھرائن بولی،

"تم جانتے ہو، میں اُردو نہیں جانتی، پھر بھی اس میں گٹ پٹ کیے جا رہے ہو؟ یہ بدتمیزی نہیں؟"

آغا نے کہا،

"ضرور ہے!"

سکندر نے آغا سے کہا،

"تو معافی مانگو مس کیتھرائن سے، نالائق کہیں کے!"

کچھ دیر کے بعد، چند اور دوست آ گئے، سکندر نے ٹینس کے لیے اصرار کیا، نہ کیتھرائن کا جی چاہ رہا تھا، نہ آغا کا جی نہ چاہنے کے وجہ، دونوں کے مختلف تھے، لیکن دونوں کو بادل نخواستہ شریک ہونا پڑا، مزید اتفاق یہ کہ کیتھرائن اور آغا کو ایک دوسرے کا پارٹنر بھی بننا پڑا،

مغرب کے بعد، کھیل ختم ہو گیا، تھوڑی دیر بیٹھ کر، سب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے، کیتھرائن اور آغا، ساتھ ساتھ اٹھے، لیکن الگ الگ گئے، سکندر بدستور بیٹھا رہا، آغا نے چلتے ہوئے کہا بھی،

"اب کیوں میخ کی طرح جمے بیٹھے ہو، چلو!"

اس نے کہا،

"بھئی بُرا نہ مانو تو ایک بات کہیں!"

"فرمائیے!"

"تمہارے ہاتھ کا کھانا کھاتے کھاتے طبیعت بھر گئی!"

"میں تو آپ کی خاطر سے پکا لیتی تھی ——— کل سے باورچی پکائے گا!"

سکندر نے کہا،

"کل میرے چند دوستوں کی دعوت ہے، کیوں نہ کمپی ٹیشن ہو جائے؟"

طلعت نے پوچھا،

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم، اور، رخسانہ بہن، دونوں کھانا پکائیں، دیکھیں کون اچھا پکاتا ہے؟ ——— جس نے اچھا پکایا اسے انعام ملیگا!"

"اے چلو ہٹو بھی، یہ لو، رخسانہ سے کھانا پکوائیں گے کچھ تمہاری عقل ماری گئی ہے!"

رخسانہ نے کہا،

"کیا حرج ہے پکا دوں گی!"

سکندر اُچھل پڑا،

"شاباش، میری بہن، تمہاری سعادت مندی سے یہی امید تھی! ——— لیکن اپنا سارا ہنر صرف کر دو، کل کے کھانے میں!!"

طلعت نے پوچھا،

لیکن تم کہتے ہو تو آجاؤں گا!"

سکندر نے جانے کے لیے، اٹھتے اٹھتے کہا،

"کہو تو میں آجاؤں، پینے کے لیے؟"

قریشی نے جواب دیا،

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ آجاؤں گا، اور کسے کسے بلایا ہے؟" "کسی کو بھی نہیں، بس تم، آغا، مس کیتھرائن چند اور دوست! ان لوگوں سے پہلے ہی طے کر چکا تھا، تم سے اب کہہ رہا ہوں!"

سکندر چلا گیا، اور سیدھا، گھر پہنچا، میز پہ کھانا چنا جا چکا تھا طلعت اور رخسانہ بیٹھ رہی تھیں، سکندر نے کرسی پہ بیٹھتے بیٹھتے طلعت سے کہا،

"اللہ ری بھوک ——— ماشاء اللہ آج کل ہاضمہ بہت اچھا ہے!"

رخسانہ نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا، طلعت ہنسنے لگی، اس نے کہا،

"میں کھاتی ہی کیا ہوں، جو نظر لگانے بیٹھ گئے!"

سکندر نے کہا،

"واہ بھئی، یہ بھی خوب رہی، چور کی داڑھی میں تنکا اسی کو کہتے ہیں میں کہہ اپنے کو رہا تھا اور چپاں اپنے اوپر کر لیا!"

طلعت بولی،

"اچھا کھانا کھاؤ!"

سب لوگ خاموشی کے ساتھ کھانا کھانے لگے، کھانے کے بعد سکندر نے طلعت سے کہا

اِنکار و اِقرار

سکندر بڑا مجلس طراز آدمی تھا، اس کے فاضل وقت کا بڑا حصّہ بزمِ احباب میں صرف ہوتا تھا، دوستوں کے انتخاب میں وہ بہت احتیاط برتتا تھا، لیکن جس کا دوست بن جاتا تھا، یا جسے دوست بنا لیتا تھا اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار رہتا تھا،

یوں تو شہر میں اس کے متعدد دوست تھے، آغا بڑا جیالا نوجوان تھا، طبروق کی جنگ میں اس نے بڑی پامردی سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے، قریشی، گذشتہ آٹھ ماہ سے ملٹری ہاسپٹل کا انچارج بنا تھا، بڑا ذہین، اور کامیاب ڈاکٹر تھا، ہندوستان سے باہر اس نے کبھی قدم نہیں رکھا تھا، لیکن پلاسٹک سرجری کا ماہر خصوصی تھا، اس فن کے

"کون ہیں یہ لوگ، جن کے لیے یہ اہتمام ہو رہا ہے؟"

سکندر نے جواب دیا،

"ہیں ہمارے چند دوست، اگر زیادہ اشتیاق دید ہو تو چلو ابھی ملا لاؤں!"

طلعت نے کہا،

"اے ہٹو بھی ———— آج تمہیں ہوا کیا ہے؟ میں کیوں جاتی کسی سے ملنے یا دیکھنے؟ واہ، جو منہ میں آیا، بک دیا، ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں!"

سکندر، ایک قہقہہ لگاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا، رخسانہ اور طلعت میں باتیں ہونے لگیں، کل کیا کیا پکے گا؟ رات کو بڑی دیر تک یہی پروگرام بنا کیا!

جب بنگلہ پر پہنچا، تو فیلڈن ہسپتال جا رہا تھا، اس نے کہا،

"ہلو آغا!"

لیکن آغا اس وقت کسی دوسرے عالم میں تھا، اس نے کہا،

"ہاں ہاں ہلو، ——— لاحول ولا قوۃ ——— کیتھرائن کہاں ہیں؟"

فیلڈن مسکرانے لگا، اس نے کہا،

"تم اندر جاؤ، میں ہسپتال جاتا ہوں!"

آغا، اندر پہنچا، کیتھرائن بنی ٹھنی باہر نکلنے کی تیاری کر رہی تھی آغا کو دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکی؛ آغا نے کہا،

"اگر میرا آنا ناگوار ہو تو واپس چلا جاؤں؟"

بالکل خلافِ معمول، پہلی مرتبہ، اس نے، اخلاق و تپاک کے ساتھ جو شاید ڈاکٹر قریشی کی سرد مہری کا ردِّ عمل تھا، کہا،

"کیوں چلے جاؤ؟ آؤ بیٹھو!"

اس اخلاق و تپاک پر، آغا کا یہ حال ہوا کہ ——— جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں! وہ بیٹھ گیا، اور کہا،

"آج سکندر کے ہاں چلنا ہے!"

وہ بولی،

"ہاں چلنا ہے!"

"کیا میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟" ———

جاننے والے سارے متحدہ ہندوستان میں چند ہی ڈاکٹر ہوں گے، اور پاکستان میں تو وہ تنہا، اس فن کا امام تھا، نہ جانے میدان جنگ کے کتنے بگڑے چہروں کو اس نے اپنی پیوند کاری سے پھر اچھا خاصا بنا دیا تھا، بہت مختصر مدت میں قریشی نے، وہ ہر دل عزیزی، حاصل کر لی جس پر بڑے بڑے تجربہ کار اور کہنہ مشق ڈاکٹر رشک کرتے تھے، لیکن، اس کامیابی کے باوجود قریشی ہر وقت خاموش رہتا تھا، کوئی اندرونی غم تھا جو اسے کھائے جا رہا تھا، وہ نہ کسی سے ملتا تھا، نہ کسی کے ہاں آتا تھا، بس آغا، اور سکندر، یہ دو آدمی تھے، جنھیں اُس نے اپنا دوست اور معتمد بنایا تھا، ان دونوں کا اکثر وقت قریشی کے ہاں، اور قریشی کا اکثر وقت، ان دونوں کے ہاں بسر ہوتا تھا،

اور پھر کچھ عرصہ بعد، مس کیتھرائن ٹپک پڑی، اس کا بھائی، فیلڈن ملٹری ہسپتال کا سرجن تھا، یہ خود گورنمنٹ کالج فار ویمن میں پروفیسر تھی، فیلڈن کے توسط سے، ڈاکٹر قریشی سے ملاقات ہوئی، پھر فیلڈن تو پیچھے رہ گیا، اور کیتھرائن اتنی آگے بڑھ آئی، کہ پیچھے لوٹنا مشکل ہو گیا، کیتھرائن ڈاکٹر قریشی پر دل و جان سے فریفتہ تھی، اور آغا کیتھرائن پر، آغا، اور قریشی کے باعث، سکندر، سے بھی کیتھرائن کا خلا ملا ہو گیا،

آج سکندر کے ہاں دعوت تھی، آغا نے سوچا، قریشی کو لیتا ہوا، وہاں جائے، لیکن راستہ میں خیال آیا، کیتھرائن کو بھی ساتھ لے لے، اس نے اپنی کار پھر پیچھے موڑی، اور کیتھرائن کے بنگلہ کی طرف روانہ ہو گیا، وہ

"چلو!"

دونوں باہر آئے آغا اپنی کار خود ڈرائیو کر رہا تھا، کیتھرائن بھی آ کر سامنے بیٹھ گئی، بنگلہ سے کچھ دُور جا کر، آغا نے کہا،

"ابھی پورا ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے، ذرا کلفٹن کی سیر بھی کریں؟ ——ہے اجازت!"

کیتھرائن خاموش رہی، اور آغا نے کار کا رُخ کلفٹن کی طرف پھیر دیا سمندر کے کنارے آہستہ آہستہ کار چلتی رہی، پھر ایک سنسان اور خاموش مقام پر ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی، کیتھرائن اس وقت کسی گہری فکر میں مستغرق تھی، اسے خاموش دیکھ کر آغا نے کہا،

"کیتھرائن!"

وہ چونک پڑی، سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا

"ہاں، کہو، کیا کہتے ہو؟"

آغا بولا،

"سنو گی؟"

"کیوں نہیں!"

آغا پر اس وقت ایک تاثر طاری تھا، اس نے کہا،

"اپنا دل کھول کر تمھیں کتنی دفعہ دکھا چکا ہوں، لیکن تمھاری طرف سے ٹھوکر کے سوا کوئی جواب نہیں ملا!"

کیتھرائن کچھ دیر خاموش رہی، پھر اس نے کہا،

"ہرگز نہیں!"

اور وہ مسکرادی، اس جاں نواز تبسم کا مطلب تھا،

"ہاں ضرور!"

محبوبۂ دل نواز کو مہربان پاکر، آغا صاحب جم کر بیٹھ گئے، انھوں نے فرمایا،

"چلو چلیں!"

وہ بولی،

"چلتے ہیں، آئے ہو تو بیٹھو ذرا دیر!"

گھنٹی بجائی، بیرا حاضر ہوا، حکم دیا،

"چائے!"

وہ سر جھکا کر چلا گیا، آغا نے کہا،

"دعوت میں چلنا ہے!"

وہ مسکرائی،

"ہاں! —— لیکن چائے پی کر! ابھی تو بہت دیر ہے، ۶ بجے ہیں، اور وہاں آٹھ بجے پہنچنا ہے!"

فوراً چائے تیار ہو کر آ گئی، اپنے ہاتھ سے کیتھرائن نے چائے بنا کر آغا کو پیش کی، اور اس انداز کے ساتھ کہ پیالی میں اگر چائے کے بجائے زہر بھی ہوتا تو بھی آغا صاحب شیر و شہد کی پی جاتے!

چائے سے فراغت کے بعد، کیتھرائن اٹھی،

آغا نے اصرار کیا،

"جواب، دو!"

کہنے لگی،

"نہ میں کسی کو چاہتی ہوں، نہ مجھے کوئی چاہتا ہے!"

آغا نے تردید کی،

"غلط ——— تم بھی کسی کو چاہتی ہو، اور تمھیں بھی کوئی چاہتا ہے ——— لیکن تم جسے چاہتی ہو، وہ کوئی اور ہے، اور جو تمھیں چاہتا ہے وہ کوئی دوسرا ہے، کیوں نہ سمجھوتہ کر لو!"

"سمجھوتہ؟"

"ہاں ——— اسے چاہنے لگو، جو تم پر جان دیتا ہے!"

وہ مسکرائی،

"یعنی تم؟"

"کیا تمھیں کچھ شک ہے اس میں؟"

"شک کا سوال نہیں"

"پھر؟ پھر کیا؟"

"اب مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا!"

"کسی پر بھی نہیں؟"

"کسی پر نہیں!"

"کیوں؟ یہ بھی بتا دو!"

"کچھ اور باتیں کرو آغا!"
بڑی بے بسی کے ساتھ آغا نے کہا،
"وہی ہُوا نا جو میں کہتا تھا؟ ——— ایک ٹھوکر اور لگ گئی!"
کیتھرائن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے کہا،
"تم یہ باتیں کرو گے، تو میں رو دوں گی، میرا دل بھی دُکھا ہُوا ہے!"
آغا بولا،
"ہاں میں جانتا ہوں ——— مجھے سب کچھ معلوم ہے!"
وہ حیرت سے بولی،
"کیا معلوم ہے؟ کیا جانتے ہو؟"
آغا نے کہا،
"تم قریشی سے محبت کرتی ہو،
لیکن وہ تم سے محبت نہیں کرتا! میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن تم مجھے نہیں چاہتیں!"
کیتھرائن کو جوش آ گیا،
"جو مجھے نہیں چاہتا، میں بھی اسے نہیں چاہتی!"
آغا نے پوچھا،
"اور جو تمہیں چاہتا ہے اسے؟"
وہ مسکرا دی،
"ہٹو بھی!"

"میری چاہ، تمھاری چاہت سے نہیں ہے!"

"پھر کس سے ہے؟"

"تم سے، صرف تم سے! —— مجھے یقین ہے، اگر تم میری بن گئیں، تو کچھ روز کے بعد، سچے دل سے میری بن جاؤ گی!"

"کیوں ہے یہ یقین؟"

"یقین ہے مجھے اپنی سچی محبّت پر —— محبت میں بڑا اثر ہوتا ہے کیتھرائن، وہ تمھیں میرا بنا کر رہے گی!"

کیتھرائن کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا،

"کیا یہی بات میں، قریشی کے لیے نہیں کہہ سکتی؟"

آغا بھی مسکرا دیا، اس نے کہا،

"بڑی ذہین ہو! —— لیکن تم نے کچّی بات کہی۔"

"یہ کیوں؟"

"تم ایک بات بھول گئیں"

"یاد دلا دو!"

آغا نے کہا،

"قریشی، تم جیسی پری جمال کی محبت کا جواب ضرور محبت سے دیتا —— لیکن تم نہیں جانتیں، وہ کس سے محبّت کرتا ہے، دیوانہ وار محبّت، اسی محبّت نے، اس کی زندگی برباد کر رکھی ہے، یاد رکھو، جس دن وہ اپنی محبّت میں مایوس ہو جائے گا۔ اس دن زندہ بھی نہیں رہے گا،

ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی،

"جب مجھے وہ نہ چاہ سکا جس سے میں نے محبت کی، تو وہ کیا چاہے گا جس سے میں محبت نہ کر سکی؟"

آغا ابھی اس وقت فیصلہ کن موڈ میں تھا،

"ٹھیک کہتی ہو ——————— لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے!"

"وہ کیا؟"

آغا نے بڑے اثر انگیز لہجہ میں کہا،

"کیا اس شخص کی محبت کی کوئی تھاہ ہو سکتی ہے، جو یہ جان کر بھی تمھیں چاہتا رہا، کہ تم اس سے محبت نہیں کرتیں؟"

کیتھرائن مسکرادی،

"بڑے باتونی ہو آغا!"

آغا نے کہا،

"یوں کام نہیں چلے گا ——————— آج میں فیصلہ چاہتا ہوں!"

وہ اٹھلا کر بولی،

"اد ھر ——————— کیا چاہتے ہو تم؟ ——————— بتاؤ!"

"تمھیں!"

"لیکن مجھے لے کر کیا کرو گے، جب کہ خود کہہ چکے ہو، میں تمھیں نہیں چاہتی!"

بھی یہی خیالات اس کے ذہن و دماغ میں گردش کر رہے تھے، اس نے کہا،

"اب یہ رام کہانی ختم بھی کروگے!"

بیتابی کے عالم میں آغا نے کہا،

"ابھی ختم ہو سکتی ہے، لیکن ایک شرط ہے!"

"وہ کیا؟"

"تم ہاں کہدو ——— بس ایک بات پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا! ———!"

بڑے ناز و انداز کے ساتھ کہا،

"اور اگر نہ کہوں تو؟"

آغا نے کار سے اترتے ہوئے کہا،

"تو اس کار پر تم واپس جاؤ، لیکن مجھے خوشی ہوتی!"

کیتھرائن بھی کار سے اتر آئی،

"چلو ہم دونوں سمندر میں ڈوب مریں!"

آغا نے کہا،

"پہلے میں پھر تم ——— میرے ساتھ اگر تم سمندر میں کودیں تو نہ میں ڈوبوں گا، نہ تمھیں ڈوبنے دوں گا، بچا کر نکال لاؤں گا!"

کیتھرائن نے آغا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، اور کہا،

"دیوانے نہ بنو، چلو! ——— آٹھ بج رہے ہیں!"

اُمید کی ایک ہلکی سی کرن ہے، جو اسے زندہ رکھے ہوئے ہے!"

آغا کی تقریر سے کچھ دیر سناٹا سا چھایا رہا، کیتھرائن بھی خاموش تھی، اور آغا بھی، پھر اس نے کہا،

"قریشی بڑا پیارا آدمی ہے، بڑا اچھا دوست ہے، بہت اونچا انسان ہے، وہ اس قابل ہے کہ اسے چاہا جائے، پوجا جائے ——— لیکن کیتھرائن، اتنے اچھے آدمی کے راستے میں، دیوار بننے کی کوشش نہ کرو، ایسے خوب تر انسان کے راستہ کا پتھر نہ بنو، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ——— تم میری بن کر بھی اسے چاہتی رہو، بخدا مجھے اعتراض نہ ہوگا، وہ اس قابل ہے کہ اسے چاہا جائے، میں بھی تم سے کم اسے نہیں چاہتا، شاید کچھ زیادہ چاہتا ہوں ——— یہ دوسری بات ہے کہ میں اس سے شادی کی درخواست نہیں کر سکتا ———"

کیتھرائن کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس نے کہا،

"قریشی سے تمھاری ایک بات جڑوں گی، تم بڑے شریر ہو!"

کل شام کو، قریشی نے کیتھرائن سے جو باتیں کی تھیں، اور جس انداز میں کی تھیں، ان کی بنا پر اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی، اس کی نہیں بن سکتی، اسے اپنا نہیں بنا سکتی، اسی لیے، آج آغا سے وہ التفات کے ساتھ پیش آ رہی تھی، ورنہ اس سے پہلے اس نے کبھی سیدھے منہ بات بھی نہیں کی تھی! وہ کل ہی یہ فیصلہ کر چکی تھی، قریشی کو، کھو کر، اگر آغا مل جائے، تو سودا زیادہ برا نہیں، اس وقت

کا۔ چل پڑی، کیتھرائن، مسکراتی ہوئی بولی،
"بڑے بھولے ہو!"
آغا نے عالمِ سرخوشی میں کیتھرائن کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا،
"یہ کیوں؟"
وہ بڑی سادگی سے بولی،
"آ گئے باتوں میں!"
آغا کا چہرہ اُتر گیا،
کیتھرائن ہنس پڑی
بے وقوف بھی بہت بڑے ہو!"
آغا کا چہرہ پھر بحال ہوگیا وہ بولا،
"اس کی وجہ بھی بتاؤ!"
اس نے معصومیت کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا،
"جو سنتے ہو یقین کر لیتے ہو!"
پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس نے کہا،
"میں کیتھرائن ہوں ——— جب میں نے ہاں کہدیا تو اب اسے نہیں، کوئی نہیں بنا سکتا!"
آغا نے پوچھا،
"کہو تو قریشی کے ہاں ہوتے چلیں، اگر ہو تو ساتھ ہے میں؟"
وہ بولی،

آغا نے کہا،

"میرے چلنے کی صرف ایک شرط ہے، ہاں کہدو، اور لے چلو مجھے جہاں چاہو!"

وہ بولی،

"اچھا کہدوں گی، اب چلو تو کسی طرح، وہاں سب انتظار کر رہے ہوں گے!"

آغا اس وقت اڑا ہوا تھا، اس نے کہا،

"آٹھ نہیں اٹھارہ بج جائیں، میں تو بغیر اقرار کرائے یہاں سے کھسکنے کا نہیں!"

وہ جل کر بولی،

"بڑے ضدی ہو!"

آغا نے پوچھا

"میں کہ تم؟"

وہ اٹھ کر بولی،

"اچھا بھئی کہدیا، ہاں ——— اب آؤ، بیٹھو گاڑی میں کسی طرح ——— تم نے تو ناک میں دم کر دیا!"

آغا خوش خوش گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا، کیتھرائن اس کے پہلو میں بیٹھ گئی، آغا نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا،

"شکریہ!"

بیداری یا خواب

آغا اور کیتھرائن قریشی کے ہاں پہنچے، لیکن وہ جا چکا تھا، یہاں سے سیدھا یہ قافلہ، سکندر کے ہاں پہنچا، تمام احباب پہنچ چکے تھے، صرف انہی دونوں کا انتظار تھا، سکندر نے کہا،

"اب آئے ہو؟"

آغا نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا،

"ان کی کیتھرائن کی وجہ سے دیر ہوگئی!"

قریشی نے کہا،

"اخاہ ——— یہ بات ہے، ہجر و فراق کی ساری کسر آج ہی نکال لی؟"

سب لوگ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے، اور خوش گپیاں

"بہت دیر ہو چکی ہے، وہ جا چکے ہوں گے!"

"نہیں کیا مضائقہ ہے، ابھی پہنچ جاتے ہیں!"

مہ کار، مہوش کی کوٹھی کی طرف، نسیم سحر کی طرح، اٹھکھیلیاں کرتی روانہ ہوگئی!

تھی، طلعت نے کہا،

"میرا کہنا تو تم نے نہیں مانا، اب تمہارے بھائی لینے آئے ہیں، انھیں بھی ٹال دو تو جانوں!"

رخسانہ سکندر کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی، سکندر نے کہا،

"یہ کیا مذاق ہے؟ کھانا تم پکاؤ، امداد طلعت کو ملے؟ میں یہ نہیں گوارا کر سکتا، یہ تو وہی بات ہوئی، دکھ اٹھائیں بی فاختہ، کوّے انڈے کھائیں ——— چلو، اٹھو!"

رخسانہ نے کسمساتے ہوئے کہا،

"مجھے اتنے سارے مردوں میں بیٹھتے نہیں اچھا لگتا، آپ جائیے، میں یہیں کھالوں گی!"

سکندر نے کہا،

"یہ نہیں ہو سکتا، چلتی ہو تو چلو، ورنہ سب کو میں یہیں بلوائے لیتا ہوں ——— جس طرح تم میری بہن ہو، اسی طرح میرے دوستوں کی بھی!"

رخسانہ شرماتی ہوئی بولی،

"توبہ اللہ، آپ تو مانتے ہی نہیں!"

سکندر نے کہا،

"ہاں بھئی، اس معاملہ میں صلح نہیں ہو سکتی ——— طلعت ذرا ہمت کرو!"

ہونے گئیں، قریشی سب سے الگ اور بالکل خاموش بیٹھا تھا، اتنے میں طلعت آئی، اس نے کہا،

"کھانا تیار ہے، آئیے!"

سب لوگ ڈائننگ روم میں پہنچے، میز پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے، ایک سے ایک بڑھ کر لذیذ اور مرغن، بیچ میں قریشی تھا، داہنی طرف، سکندر، اور بائیں جانب طلعت، طلعت کے پاس کی کرسی خالی تھی، سکندر نے طلعت سے کہا،

"ارے بھئی طلعت، ہماری بہن اکیلی کھائے گی؟ جاؤ اسے بھی لے آؤ!"

طلعت بولی،

"وہ نہیں آتی، میں تو کہتے کہتے تھک گئی!"

سکندر نے کہا،

"جی نہیں! —— اسے آنا پڑے گا، ہم لائیں گے اسے جا کر، بغیر دولھا کی بارات کے کیا معنی؟ یہ کھانا اس نے پکایا ہے، اور داد تم لوگی؟"

طلعت مسکرا دی،

"تو جائیے لے آئیے، اپنی بہن کو، اور خوب داد جی بھر کے دلوائیے!"

"ہاں ایسا ہی ہوگا! —— لیکن تم بھی میرے ساتھ چلو!"

طلعت اور سکندر پہنچے، رخسانہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی ہوئی

نازنین قریشی کے پہلو میں نہ بیٹھے، کاش قریشی کی نظریں اس پر نہ پڑیں، اس کی ایک تمنا تو پوری ہو گئی، مگر دوسری نہیں ہوئی، یعنی قریشی بدستور نظریں نیچی کیے، اپنی کرسی پر بیٹھا رہا، لیکن طلعت نے، اسے قریشی کے پاس والی کرسی پر بٹھا دیا، اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گئی،

سکندر نے کہا،

"بسم اللہ!"

اور سب لوگوں کے ہاتھ، قابوں، اور پلیٹوں کی طرف لپکے، رخسانہ نے پلیٹ اپنے سامنے رکھ لی، قاب پر قریشی کا ہاتھ پڑا، اس نے ازراہ اخلاق، منہ پھیر کر، رخسانہ کی طرف بڑھائی، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں!

آنکھیں چار ہوئیں، اور!

اور!

دفعتہً دونوں کے منہ سے ایک ساتھ چیخ نکلی،

"رخسانہ!"

"ریاض"

ریاض کے ہاتھ کانپنے لگے، قریب تھا کہ قاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے، لیکن سکندر نے سنبھالا، بڑی شفقت سے، اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا، اور کہا،

"ہاں ہاں، یہ رخسانہ ہے، تمہاری امانت ——— لیکن گھبراتے کیوں ہو، کھانا کھالو، پھر اطمینان سے ملنا!"

وہ بولی،

"میں کیا کروں؟"

سکندر نے کہا،

"لاحول ولا قوۃ ——— بڑی ناسمجھ ہو، فدا ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ، اور سہارا دیتی ہوئی لے چلو ——— کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، لوگ انتظار کر رہے ہیں!"

رخسانہ اپنے محسن کے اصرار کو اب رد نہ کر سکی، اس نے کہا،

"چلیئے!"

پہلے اس نے خوب اپنا دوپٹہ وغیرہ درست کیا، پھر ان دونوں کے ساتھ چلی، آگے آگے سکندر، پھر طلعت، پھر رخسانہ،

ڈائننگ ہال میں سب سے پہلے آغا، اور کیتھرائن کی نظریں رخسانہ سے چار ہوئیں، وہ غیر یورپین حسن کی ذرا بھی قائل نہیں تھی، لیکن نہایت سادہ وضع میں رخسانہ کو دیکھ کر ایک جھرجھری سی آگئی اسے، وہ سوچنے لگی، شاید آسمان سے چاند اتر آیا ہے، دل ہی دل میں حیرت کر رہی تھی، اور ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی کہ قدرت غلط بخش ہے، یہ حسن بے مثال اس نے دیا بھی تو ایک مسلمان لڑکی کو، جو زینت محفل بنتے ہوئے شرمائی جا رہی ہے، لجائی جا رہی ہے، یہ بات اس کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتی تھی، کہ چراغ خانہ بننے میں جو لطف ہے وہ شمع محفل بننے میں نہیں، اور نہ جانے کیوں یک بہ یک اس کے دل میں خیال آیا کہ کاش، یہ الھڑ

رہے تھے، لیکن بالکل اجنبی بنے ہوئے تھے، یکسر خاموش تھے، البتہ کینتھرائن کی نظر بار بار، ریاض اور رخسانہ پر پڑتی تھی، وہ کبھی ریاض کو تکنے لگتی تھی، کبھی رخسانہ کو، وہ یہ سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ ان دونوں نے اتنی بیتابی کے ساتھ ایک دوسرے کو کیوں پکارا؟ کیا یہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں؟ محبت کرتے ہیں آپس میں؟

وہ یہی سوچ رہی تھی، کہ سکندر اٹھا، ہاتھ دھونے کے لیے نہیں، تقریر کرنے کے لیے،

سکندر نے کہا،

"یہ ہمارے دوست ریاض حسین قریشی! جنھیں اب تک آپ نے گم صم پایا، اب بلبل کی طرح چہکیں گے، آپ نے دیکھا ان کی شاندار کوٹھی میں اُلّو بولتا رہتا تھا، اب وہاں محبت کے نغمے گونجیں گے، آپ جانتے ہیں، ان کی زندگی یکسر غم و الم تھی، لیکن اب، ہنسیں گے، اور چہچہائیں گے، آپ کو معلوم ہے، یہ دنیا سے بیزار تھے، لیکن اب یہ اپنی دنیا آباد کریں گے، ایک نئی دنیا بسائیں گے!

ریاض میرا پرانا ساتھی ہے، ہم دونوں نے ساتھ ساتھ لاہور میڈیکل کالج سے سند حاصل کی، یہ اپنے وطن دلی چلا گیا، رئیس زادہ تھا، دولت کی گود میں کھیلنے لگا، میں نے شادی کی، اور طلعت کو لے کر سیر سپاٹے کے لیے لندن چلا گیا، جس روز میرا طیارہ دلی پہنچا، اس روز وہاں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، مسلمان بھیڑ بکری کی طرح

ریاض، اور، رخسانہ کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے، اور سب لوگ متعجب تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ خاص طور پر، کیپٹن راٹن کی حیرت تو قابل دید تھی، اس ڈرامے کا راز اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا!

کھانا شروع ہوا،

سب لوگ اطمینان سے ہاتھ مار رہے تھے، لیکن ریاض اور رخسانہ کا نہ منہ چل رہا تھا، نہ ہاتھ، یہ دونوں وقت گزاری کے لیے صرف ٹونگ رہے تھے، سکندر نے یہ کیفیت دیکھ کر ڈانٹا،

"کھانا کھاؤ ریاض!"

طلعت نے اپنے ہاتھ سے رخسانہ کی پلیٹ میں بہت سی چیزیں ڈال دیں، اور کہا،

"کھانا کھالو، پھر اطمینان سے نظارہ کر لینا!"

اس کا دل بلیوں خوشی سے اچھل رہا تھا، اور یہی کیفیت ریاض کی بھی تھی، دونوں ایک دوسرے سے مایوس ہو چکے تھے، ایک دوسرے کو مردہ سمجھ چکے تھے، لیکن آج یک بیک مل گئے، ریاض دل ہی دل میں کہہ رہا تھا، ——— "اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں؟"

اور رخسانہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی، ——— "خواہش دلوں کی تم ہو، آنکھوں کی آرزو تم ہو!"

کھانے کے دوران میں، ریاض، اور رخسانہ نے ایک دوسرے سے بالکل بات چیت نہیں کی، دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سن

کے ساتھ گردن ہلائی، میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، دلّی میں طبّی امداد کا قابل اطمینان انتظام ناممکن تھا، میں نے میجر شرما سے کہا، میں لاہور جاؤں گا، ریاض کو اپنے ساتھ لے کر، طیارے کی سیٹ کا انتظام کیجیے، انھوں نے، اپنے فوجی اثر و رسوخ سے کام لے کر ایک گھنٹہ کے اندر اندر انتظام کردیا: میں اور طلعت، ریاض کو لے کر لاہور پہنچے، ہوائی اڈہ سے سیدھے ہسپتال آئے، اور ریاض کو داخل کردیا،

کئی دن کے بعد، ریاض ہوش میں آیا، کئی ہفتے کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ بات کرسکے، ڈاکٹروں نے کہا، اب ریاض کا لاہور میں رہنا مناسب نہیں ہے، اسے کوئٹہ یا زیارت تبادلۂ آب و ہوا کے لیے جانا چاہیئے، میں اسے لیکر کوئٹہ، پھر زیارت پہنچا، یہاں کی آب و ہوا نے خاطر خواہ اثر کیا، اور دو ہفتہ کے بعد، ریاض بڑی حد تک تندرست ہوگیا،

اب ریاض کو اپنے عزیزوں کی فکر ہوئی، میں کئی بار دلّی گیا، لاہور گیا، بہت ڈھونڈا، لیکن کسی کا سراغ نہیں ملا، سبزی منڈی، قرول باغ، اور پہاڑ گنج، یہی تین مقامات ریاض کے عزیزوں کے مسکن تھے، اور یہیں سب سے زیادہ قتل عام ہوا، آخر ہم لوگ رو دھو کر بیٹھ رہے، سمجھ لیا، سب اللہ کو پیارے ہوئے،

لیکن ریاض کے دل سے ریحانہ کی یاد نہ گئی ———

کاٹے جارہے تھے، ہم دونوں میاں بیوی نئی دلی میں ڈاکٹر شرما کے بنگلہ میں قید تھے، ڈاکٹر صاحب، میرے اُستاد ہیں، باپ سے زیادہ شفیق، اور مہربان، انھوں نے ہم دونوں کو قید کرلیا تھا، کہ ہم مارے نہ جائیں،

لیکن میرا دل، ریاض کے لیے تڑپ رہا تھا، دنیا میں مَیں نے کسی کو اتنا نہیں چاہا جتنا ریاض کو، وہ میرا دوست بھی ہے، اور بھائی بھی، میں نے ڈاکٹر شرما سے کہا، ہر قیمت پر مجھے ریاض سے ملنا ہے، اس کی خیریت معلوم کرنا ہے، خواہ اس تلاش میں میری جان کیوں نہ چلی جائے،

ڈاکٹر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی، میجر شرما کو حکم دیا کہ وہ مجھے لے کر پہاڑ گنج جائیں، ایک فوجی ٹرک پر، چند مسلح سپاہیوں کے جلو میں ہم لوگ، پہاڑ گنج پہنچے، ریاض کا آبائی مکان یہیں تھا، میں دلی جب آتا تھا یہیں ٹھہرا کرتا تھا، میں سیدھا وہاں پہنچا، لیکن اس وقت جب خالی مکان آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا تھا، فرنیچر لوٹا جا چکا تھا، اور گھر کے لوگ یا قتل کیے جاچکے تھے، یا فرار ہو چکے تھے، میں نے دیکھا: گھر سے چند قدم کے فاصلے پر، ریاض زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے، معلوم ہوا، اس پر کئی آدمیوں نے حملہ کیا، سر بھی گھائل تھا، سینہ بھی، اور پیٹھ بھی، میں نے ٹرک پر اسے نیم مردہ حالت میں ڈالا اور ڈاکٹر شرما کے گھر پہنچا، انھوں نے معائنہ کرنے کے بعد، مایوسی

دی، پھر آغا نے، پھر دوسرے دوستوں نے،

تقریباً گیارہ بجے، یہ بزم احباب برخاست ہوئی، پھر ریاض، اور رخسانہ میں باتیں شروع ہوئیں، رخسانہ نے رو رو کر، اپنی ساری بپتا کہہ ڈالی،

ایک ایک واقعہ، ——————

ایک ایک بات، ——————

ہر ہر حادثہ! ——————

اور ریاض، رو رو کر یہ داستان درد سنتا رہا، صبح ہوگئی، مگر ان دونوں کی کہانی ختم نہ ہوئی،

سکندر اپنے بڈروم سے سگریٹ پیتا ہوا، سیدھا یہاں آیا، اس نے ریاض سے کہا،

"اب بس بھی کرو —————— روتے کیوں ہو؟ جو لوگ اس دنیا سے جا چکے اب وہ واپس نہیں آ سکتے، ان پہ اب رونا بیکار ہے اور کب تک روؤ گے، بہت رو چکے، اب ہنسو، اور شکر کرو، کہ رخسانہ مل گئی، آؤ چلو ناشتہ کریں —————— ہاں تم آج اپنی کوٹھی نہیں جا سکتے آج جمعہ کا مبارک دن ہے، نماز جمعہ کے بعد یہیں نکاح ہوگا، پھر شام کو اپنی دلھن کو لے کر، اپنے گھر چلے جانا،"

ان باتوں کے دوران میں طلعت بھی آگئی تھی، اس نے کہا،

"ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش نہ کرو، اتنی جلدی نکاح نہیں

یہ رخسانہ جو آج اس کے پاس بیٹھی ہے ——— یہ اس کی ماموں زاد بہن ہے، اور یہ دونوں خوب رومان لڑایا کرتے تھے، رخسانہ کے غم میں یہ گھلنے لگا، ایک روز "ڈان" میں کراچی کے ملٹری ہسپتال، اور سول ہسپتال کے لیے میڈیکل آفیسر کی پوسٹ کا اشتہار نظر سے گزرا، میں نے ایک اپنی، اور ایک ریاض کی طرف سے درخواست بھیجدی، یہ سوچ کر کہ شاید مصروفیت میں ریاض کا جی بہل جائے، اتفاق سے دونوں کی درخواستیں منظور ہو گئیں، ہم دونوں کراچی طلب کر لیے گئے، اور اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔

لیکن، ریاض ہمیشہ سے ہنسی اور ضدی رہا ہے، رخسانہ کی یاد کو یہ برابر کلیجہ سے لگائے رہا، یہ دنیا میں تھا، لیکن اس نے دُنیا کو چھوڑ رکھا تھا، حسن و جمال نے اس پر کمندیں پھینکیں، لیکن یہ ایک جھٹکے میں نکل گیا، دلچسپیوں نے اس کا دل لبھایا، لیکن اس کی آنکھوں کے آنسو خشک نہ ہوئے،

اور آخر، ایک روز رخسانہ مجھے مل گئی، میں اسے اپنی بہن بنا کر یہاں لایا، اور اب آپ سب حضرات کو گواہ بنا کر اس کا ہاتھ ریاض کے ہاتھ میں دیتا ہوں!"

سکندر نے رخسانہ کا ہاتھ ریاض کے ہاتھ میں دیا، رخسانہ شرم کے مارے کٹی جا رہی تھی، اور خود ریاض صاحب بھی اس وقت چو کڑی بھولے ہوئے تھے، سب سے پہلے کیتھرائن نے ریاض کو مبارک باد

اطلاع کرنے، اور قاضی کو تلاش کرنے چل کھڑا ہوا،

وقت مقررہ پر سب کام انجام پا گئے، جمعہ کی نماز کے بعد، نہایت سادگی کے ساتھ رخسانہ اور ریاض کا عقد ہو گیا، اتنے مختصر وقت میں سکندر نے بہن کے لیے کئی ہزار کا جہیز اکٹھا کر لیا، اور طلعت نے بھی رخسانہ کو چودھویں کا چاند بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، کیپٹن اختر نے ایک خوبصورت ہار پیش کیا۔ آغا نے انگوٹھی، دوسرے دوستوں نے بھی اچھے اچھے تحفے پیش کیے، سکندر نے بھائی بننے کا حق ادا کر دیا، اور طلعت نے بھی ثابت کر دیا، کہ اس نے جو رخسانہ کو بہن کہا تھا، تو سچے دل سے کہا تھا،

عصر کے بعد، ریاض رخسانہ کو لے کر، اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا؛

ریاض اپنی کار خود ڈرائیو کر رہا تھا، اور رخسانہ اس کے پاس بیٹھی تھی دونوں کی آنکھیں پُرنم تھیں!

لیکن یہ آنسو، عجیب آنسو تھے!

ان میں غم کی تلخی بھی تھی، اور مسرت کی چاشنی بھی، ماضی کی دلدوز یاد بھی، اور مستقبل کا خوش آئند تصور بھی، ہجر کی تلخ کامیاں بھی، اور وصل کی شادمانیاں بھی ——— تباہی، بربادی، اور ہلاکت کا افسوس بھی ——— اور سب کچھ کھونے کے بعد، سب سے عزیز، اور محبوب چیز پالینے کی خوشی بھی!

اسی کا نام دنیا ہے!

ہو سکتا۔ ابھی مجھے بہت سی تیاریاں کرنا ہیں، جمعہ ہر ہفتہ میں ایک دن آتا ہے، کسی اور جمعہ کو دیکھا جائے گا!"

سکندر نے کہا، -

"تو زہر کی پڑیا لا کر ریاض کو دے دو!"

"اے واہ، خدا نہ کرے!"

"نہیں کروگی، تو وہ خودکشی کرے گا ——— پورا دن پڑا ہے جو انتظام چاہو کر لو"

ریاض نے کہا،

"انتظام کیا کرنا ہے، خالی قاضی کو بلا لو، اور چند دوستوں کو، نہ ڈولا نکلے گا، نہ برات آئے گی!"

سکندر نے طلعت سے کہا،

"دیکھ لی بیتابی حضرت کی، بالکل تیار بیٹھے ہیں! ——— کیوں رخسانہ تمھاری کیا رائے ہے؟"

وہ شرماتی ہوئی سمٹ کر بیٹھ گئی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا، طلعت مسکرانے لگی،

ناشتہ سے فراغت کر کے طلعت، اور سکندر موٹر میں بیٹھ کر شہر پہنچے جلدی جلدی، کچھ ساڑیاں، کچھ کپڑے، کچھ زیورات خریدے، اور دوپہر تک لدے پھندے گھر آئے،

طلعت، رخسانہ کو دلہن بنانے کی تیاریاں کرنے لگی، سکندر، دوستوں کو

ہمارے مطبوعہ

ناول

کتاب	مصنف	قیمت
خونؔ	از قیسی رام پوری	[illegible]
دل	از رئیس احمد جعفری	[illegible]
عورت	" " " "	[illegible]
مجاہد	" " " "	[illegible]
درد	" " " "	[illegible]
ایک مہاجر	" " " "	[illegible]
سنگدل	از یحییٰ صدیقی	[illegible]
پُل صراط	از سعید مظفر ایم۔ اے	[illegible]
نئی صبح	" " " "	[illegible]
دیوار	از عابدی جعفر	[illegible]
قربانی	از عثمان علیم صدیقی	[illegible]
چور بازار	از ابراہیم جلیس	[illegible]

افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
دھڑکتے دل	از جناب اختر شیرانی	[illegible]
شیشہ و سنگ	از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی	[illegible]
اتفاقات	از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی	[illegible]
انجام حیات	از سید آل رسول قطبی	[illegible]
گورکی کے افسانے	ترجمہ سعادت حسن منٹو	[illegible]
سازِ فطرت	حسن عزیز جاوید	[illegible]
نیلوفر	" " "	[illegible]
قسمت	" " "	[illegible]
صبر و ضبط	" " "	[illegible]

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور